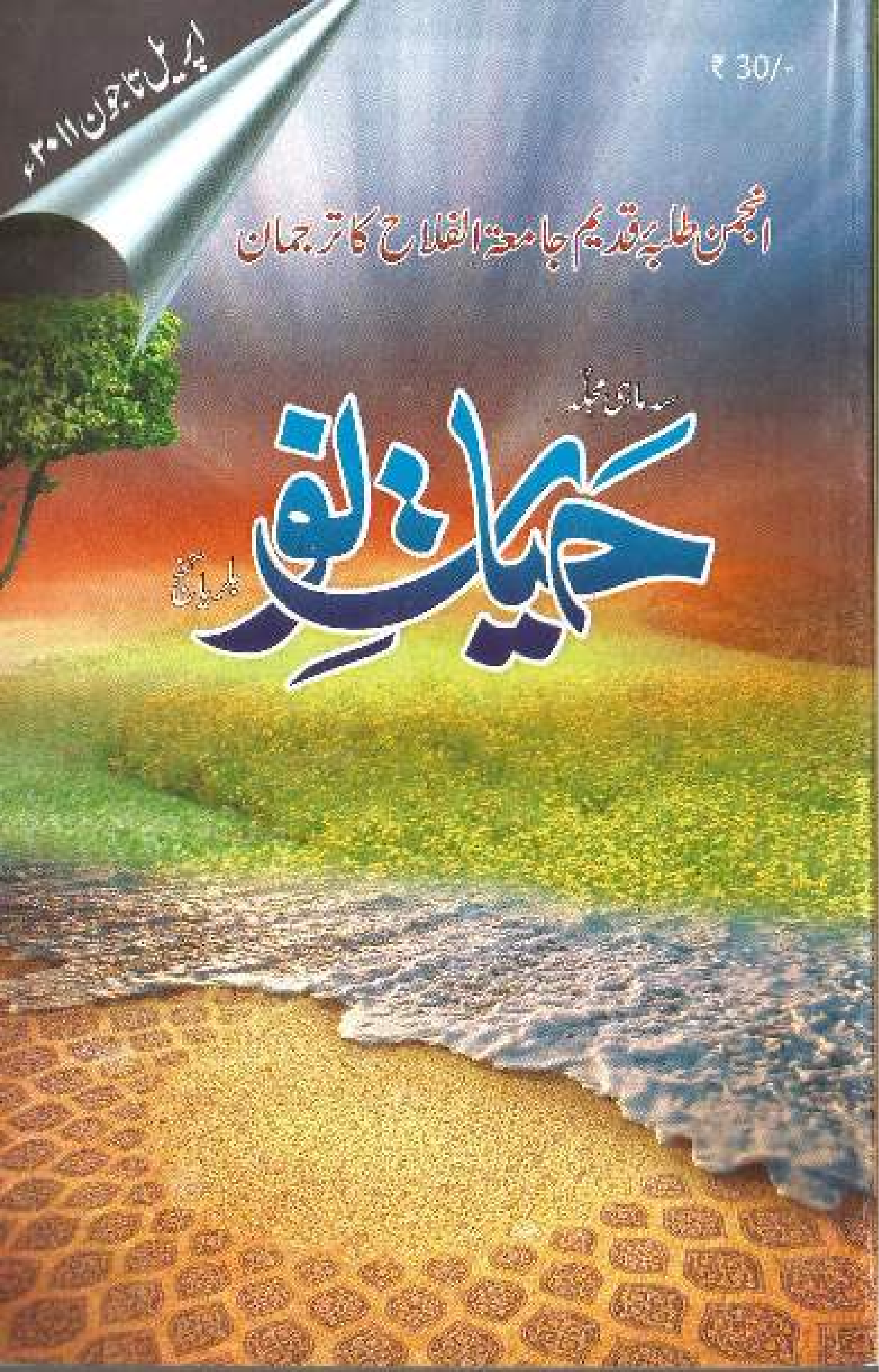
₹ 30/-
اپریل تا جون ۲۰۱۱ء
انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان
سہ ماہی مجلہ
حیات نو
بلریا گنج

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

سہ ماہی مجلہ

اپریل تا جون ۲۰۱۱ء

حیات نو

بلریاگنج

مدیر: انیس احمد مدنی

مجلس ادارت:

مطرف حسین صدیقی فلاحی	دہلی
اشتیاق احمد فلاحی	لکھنؤ
ڈاکٹر عبدالباری فلاحی	دہلی
انیس احمد مدنی فلاحی	جامعۃ الفلاح

فی شمارہ	: اندرون ملک	۳۰ روپے
	بیرون ملک	۵ امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون	: اندرون ملک	۱۲۰ روپے
	بیرون ملک	۲۰ امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	: اندرون ملک	۳۰۰۰ روپے
	بیرون ملک	۲۰۰ امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

نمائندے

لندن	: رضوان احمد فلاحی
دہلی	: نعیم احمد غازی فلاحی
علی گڑھ	: ڈاکٹر ضیاءالدین ملک فلاحی
ممبئی	: حافظ ادہم علی فلاحی
نیپال	: نذر الحسن فلاحی
یو اے ای	: خالد حسن رشید فلاحی
قطر	: محمد اکرم فلاحی
کویت	: محمد سہیل فلاحی
سعودی عرب	: انعام اللہ فلاحی

خط و کتابت کے پتے

- برائے ادارتی امور

انیس احمد فلاحی، جامعۃ الفلاح، بلریاگنج
اعظم گڑھ (یوپی)

- برائے انتظامی امور و ترسیل زر

عرفان احمد فلاحی جامعۃ الفلاح، بلریاگنج
اعظم گڑھ (یوپی)۔ 276121
موبائل: +91-9453757380
ای میل: hayatenau123@gmail.com

Typing: **Mohd. Abuzar Azmi**
Azamgarh, Mob.: 9580147500

Layout Designing & Title Designing: **sajidkhalil**@gmail.com Cell: +919889828273

فارغین جامعۃ الفلاح کے لیے خوش خبری

یہ اطلاع آپ کے لیے یقیناً مسرت کا باعث ہوگی کہ

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح

نے فارغین جامعہ کی علمی ترقی اور تربیت کے لیے مسابقہ برائے مقالہ نگاری کا فیصلہ کیا ہے۔

عنوانات برائے انعامی مقابلہ

"احیائے اسلام کی عالمی جدوجہد اور درپیش چیلنجز"

یا

"آزادی کے بعد ہندوستان کی اردو سیرت نگاری اور اسکے امتیازات"

اس مسابقہ میں جامعۃ الفلاح کے وہ فارغین جنہوں نے عالمیت یا فضیلت کی سند حاصل کی ہو نیز درجہ فضیلت کے وہ طلبہ جنہوں نے عالمیت پاس کرلیا ہو شرکت کر سکتے ہیں۔

انعام اول	بیس ہزار روپے	First Prize ₹ 20,000/-
انعام دوم	پندرہ ہزار روپے	Second Prize ₹ 15,000/-
انعام سوم	دس ہزار روپے	Third Prize ₹ 10,000/-
تشجیعی انعام	ایک ہزار روپے کے پانچ انعامات	5 Consolation Prizes ₹ 1,000/-

رجسٹریشن کی آخری تاریخ ۳۰ اگست ۲۰۱۱ء	مقالہ جمع کرنے کی آخری تاریخ ۳۰ اکتوبر ۲۰۱۱ء	نتائج کا اعلان ۳۰ نومبر ۲۰۱۱ء

نوٹ: مقالہ A4 سائز کے ٹائپ شدہ ۳۰ صفحات سے زیادہ نہ ہو۔

خط و کتابت کے لیے

ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،
علی گڑھ، یوپی ۲۰۲۰۰۲

Dr. Ziauddin Malik Falahi
Deptt. of Islamic Studies
Aligarh Muslim University
Aligarh, (U.P.) 202002
Mobile: 09927206518
E-mail: labeebzia@yahoo.co.in

نقوش حیات نو

اداریہ

قرآن سے تعلق کے تقاضے	انیس احمد مدنی	۳

عظمت کے مینار

عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ	تحریر: محمود الطحان ترجمانی: افتخار الحسن مظہری	۶

بحث و نظر

بچوں کو اغوا ہونے سے بچایئے	خالد سیف اللہ رحمانی	۱۰

مقالات

دینی مدارس میں تدریس قرآن کا مطلوبہ منہاج (آخری قسط)	اعجاز احمد قاسمی	۱۵
قرآنی اسالیب دعوت (دوسری قسط)	مقبول احمد فلاحی	۳۴
علوم حدیث میں شاہ ولی اللہؒ کی خدمات	انیس احمد مدنی	۵۰
تعلیم کے بنیادی مقاصد	ولی اللہ مجید قاسمی	۷۵
جامعہ کے لیل ونہار	عبدالرقیب فلاحی	۹۰
روداد انجمن	"	۹۶

قرآن سے تعلق کے تقاضے

انیس احمد مدنی

قرآن مجید مسلمانوں کا ہمہ گیر ضابطہ حیات ہے۔ یہ مذہبی ضابطہ بھی ہے اور سماجی بھی دیوانی بھی فوجداری بھی۔ اور ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو ہماری جسمانی و روحانی زندگی کی ایک ایک چیز کا بندوبست کرتا ہے۔ یہ قرآن، دساتیر عالم پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے کہ اس میں کسی مخصوص علاقے، خطے یا نسل وقوم کے مفادات کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، پوری انسانیت ہی نہیں بلکہ پوری کائنات کے حقوق ومفادات کا تحفظ کیا گیا ہے۔ اسی لیے اس کے نزول کو پورے عالم کے لیے رحمت قرار دیا گیا ہے۔

تمام ہی آسمانی کتابوں کا یہ عطر اور نچوڑ ہے اور اپنی محفوظیت، زندہ زبان، تاثیر وشفاء، ابدیت، معیار صداقت، اختلافات سے خالی ہونے، الہامی اور انسانی فطرت کے مطابق ہونے، اصول وکلیات کے بیان اور جزئیات سے اجتناب، مربوط ومنظم ہونے اور سیرت نبویہ کی شکل میں اپنی زندہ اور عملی شرح کے حامل ہونے کے اعتبار سے تمام ہی صحف سماویہ پر فوقیت رکھتا ہے۔

اس کی عظمت کا اندازہ آپ اس سے لگائیں کہ اس کائنات میں ہر چیز مخلوق ہے سوائے قرآن کے جو خالق کائنات کی ایک اہم صفت، صفت کلام کا مظہر ہے۔ قرآن مجید سراپا خیر وبرکت ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ نے خیالات کی تشکیل اور ایک مستقل تہذیب کی تعمیر کی ہے۔ عرب کے چرواہوں کو اس نے اقوام عالم کا ہادی ورہنما بنادیا۔ اس کے نزول کا بنیادی مقصد ہی اپنے متبعین کو انسانیت کے لیے باعث شرف وافتخار بنانا تھا۔ ارشاد خداوندی ہے: "انہ لذکر لک ولقومک" (الزخرف: ۴۴) یقیناً یہ قرآن آپ ﷺ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے باعث شرف ہے۔

امت مسلمہ جب تک اس کو مضبوطی سے تھامے رہی قیادت عالم کے منصب پر فائز رہی اور جیسے جیسے امت اس سے دور ہوتی گئی قعر مذلت میں گرتی گئی۔ اس کا تھامنا اقبال ورفعت کا ذریعہ اور اس سے اعراض ادبار وشکست کی بنیاد ہے۔ مفتی محمد شفیعؒ صاحب لکھتے ہیں کہ: "مالٹا کی چار سالہ جیل سے رہائی کے بعد ایک روز دار العلوم میں علماء کے بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے

حضرت (شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ صاحب دیوبندی) نے مسلمانوں کی تباہی کے اسباب بیان فرمائے: ایک قرآن مجید کی تعلیمات کو چھوڑنا اور دوسرا باہمی اختلافات اور جنگ وجدال۔ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا: اسے کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

عظمت رفتہ کی بازیابی، اقوام عالم کی قیادت ورہنمائی اور آخرت میں سرخروئی وکامیابی کا واحد ذریعہ قرآن کو مضبوطی سے تھامنے میں ہی مضمر ہے جس کے اہم تقاضے درج ذیل ہیں:

(۱) پورے قرآن پر ایمان :

یعنی ان تمام تعلیمات پر ایمان جو قرآن میں موجود ہیں۔ عقائد، عبادات، شعائر، اخلاق وآداب، تشریعات، معاملات۔ ایک مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ عقائد تو قرآن سے حاصل کرے لیکن اخلاقیات کہیں اور سے، عبادات تو قرآن سے اخذ کرے لیکن معاملات کہیں اور سے، روحانی پہلو تو قرآن سے حاصل کرے لیکن معاشی، سیاسی اور تشریعی پہلو کہیں اور سے۔ یہ تو بعینہ وہی خرابی اور کمی ہے جو بنی اسرائیل کے اندر تھی جس کی سزا قرآن پاک میں یوں وارد ہوئی ہے: "افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیاۃ الدنیا ویردون الی أشد العذاب. کہ اس کی سزا دنیا میں رسوائی اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

(۲) تلاوت کے ساتھ ساتھ اس پر تدبر و عمل :

قرآن مجید کی حقیقی قدر وقیمت اور برکت اس کے معانی میں مضمر ہے لفظ تو معنی کے ادراک کا محض ایک ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ قرآن کی برکت اس پر عمل کرنے میں اور اسے زندگی کا دستور بنانے میں ہے قرآن چلنے والوں کے لیے راہیں روشن کرتا ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ جب ہم قرآن مجید پڑھیں تو تلاوت سے ہمارا مقصد ان معانی کو جاننا ہو جو مراد ہیں۔ علامہ زرکشی لکھتے ہیں: "من لم یکن له علم و فهم وتقوی و تدبر لم یدرک من لذۃ القرآن شیئاً" (البرہان ۲/۱۷۱) جس شخص کے پاس علم وفہم، تقویٰ اور آیات پر تدبر نہ ہو وہ قرآن کی معمولی لذت سے بھی آشنا نہیں ہوسکتا۔

ابن جریر الطبری کہتے ہیں: "جو شخص قرآن کی تلاوت کرتا ہو اور اس کی تفسیر وتاویل سے ناواقف ہو وہ تلاوت میں لذت وحلاوت کیسے پاسکتا ہے (معجم الادباء ۱۸/۲۳)

(۳) تبلیغ و اشاعت :

قرآن سے تعلق کا ایک اہم تقاضا قرآنی فکر کو تمام افکار پر، اس کے عقائد کو تمام عقائد پر

دلائل وبراہین اور بحث واستدلال کے ذریعہ غالب وعام کرنا ہے۔ چونکہ یہ پوری انسانیت کی کتاب ہے لہٰذا نشر واشاعت کے جملہ وسائل وذرائع کے ذریعہ اسے عام کرنا حاملین قرآن کی ذمہ داری ہے۔ جس کی ادنیٰ ترین صورت یہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں قرآن مجید کے فصیح وبلیغ تراجم مع مختصر تشریح وتفسیر کے شائع کیے جائیں اور ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی جائے۔ اور اعلیٰ درجہ کے حق کی ادائیگی کے لیے عالم اسلام میں جابجا ایسی اکیڈمیاں اور یونیورسٹیاں قائم ہوں جن کا مرکزی موضوع قرآن حکیم ہو اور ان کے ذریعہ اعلیٰ ترین علمی سطح پر قرآن کی ہدایت کی وضاحت کی جائے۔

(۴) نزاعی و اختلافی مسائل میں اس کو پیشوا بنانا :

قرآن مجید بالاتفاق اسلامی شریعت کا مصدر اول ہے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ فقہی اختلافات میں قرآن کو پیشوا نہیں بنایا جاتا بلکہ حنفی، مالکی، حنبلی، اور شافعی آراء کی تائید وتوثیق کے لیے اس کی آیات کی تاویل کی جاتی ہے۔ احکام القرآن پر لکھی گئی جملہ کتابیں اس کی واضح دلیل ہیں۔

فقہی اختلافات کا خاتمہ اور اس میں رواداری اسی وقت ممکن ہے جب مسائل واحکام کی باگ ڈور قرآن کے ہاتھ میں دے دی جائے اور الفاظ قرآنی جس جانب رہنمائی کررہے ہوں اسے بلاتعصب تسلیم کیا جائے۔

☆☆☆

عمر بن عبدالعزیزؒ

افتخار الحسن مظہری ☆

عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہونے سے پہلے بڑی شان وشوکت والے تو تھے ہی، خود پسندی ایسی تھی کہ بڑے بڑوں سے آنکھ نہ ملاتے اور اچھے اچھوں کو خاطر میں نہ لاتے۔ مگر سیرت وکردار چاند کی چاندنی کی طرح بے داغ تھا۔ عبدالحکیم اپنی کتاب "سیرۃ عمر بن عبدالعزیزؒ" میں لکھتے ہیں:

"عمر بن عبدالعزیزؒ اموی خاندان کے بڑے خوشحال اور صاحب جاہ وجلال شاہزادے تھے۔ بادشاہت کی گود میں پل کر جوان ہوئے۔ جس راہ سے گزر جاتے گلیاں مشکبار ہو جاتیں۔ نفاست پسندی ایسی کہ لگاہیں نہ ٹھہریں۔ رفتار میں ناز وانداز کی ایسی شاہانہ دربائی کہ نوخیز لڑکیاں اس کی نقل اتارتیں، ازار اتنا لمبا کہ کبھی کبھی جوتا اس میں الجھ جاتا، لیکن شان ایسی نرالی کہ جوتا نہ نکالتے، ازار ہی چاک کر دیتے۔ شانے سے چادر اگر گر جاتی تو بے نیازی کی وہ شان کہ اس کو ہاتھ نہ لگاتے۔ مہر مارنے کے لئے انگوٹھی کو سیاہی دکھاتے تو سیاہی کی ڈبیہ عطردان میں بدل جاتی۔ شان وشوکت اور سطوت وہیبت کا کہاں یہ عالم؟ اور خلیفہ ہونے کے بعد کہاں یہ درویشی کہ آپ کے دور خلافت کو خلافت راشدہ کا نمونہ کہا گیا۔

شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ اچانک درویشانہ بے مائیگی میں تبدیل نہیں ہوا بلکہ یہ انقلاب احوال کئی سالوں کی تربیت ومحنت کا نتیجہ تھا۔ آپ کے والدین کو جب یہ محسوس ہوا کہ لڑکا ہونہار ہے تو انھوں نے مناسب خیال کیا کہ لڑکا عالمانہ وزاہدانہ فضا میں تربیت پاکر جوانی کی منزل میں قدم رکھے۔ چنانچہ آپ کی والدہ آپ کو لے کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس گئیں تا کہ وہ ان کو تعلیم وتربیت سے آراستہ کریں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کے سرزمین قلب پر تربیت کے اصولوں کی تخم کاری کی جس کے مظاہر خلیفہ ہونے سے پہلے ہی مختلف مواقع پر سامنے آنے لگے تھے۔

چونکہ شہر کی عمومی فضا پر خیر وصلاح اور زہد وتقویٰ کی حکمرانی تھی اس لئے ان تربیتی اصولوں

☆ استاذ حدیث وفقہ، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

پر عمل پیرا ہونا ان کے لئے آسان تھا۔ چنانچہ وہ ان اصولوں کو عملی طور پر برتنے لگے تھے۔ پھر جب خلیفہ ہوئے تو ان کی پوری زندگی ان اصولوں کا عملی مظہر بن گئی۔

تعلیم

عبداللہ بن عمرؓ کی تربیت، مدینہ کے پرانوار صبح وشام کی بابرکت فضا اور تعلیم حاصل کرنے کے ان کے ذوق وشوق کا نتیجہ تھا کہ عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد مجاہد بن جبیرؒ نے فرمایا:

ہم ان کو تعلیم دینے آئے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود ہم نے ان سے علم حاصل کیا۔

(طبقات الفقہاء، ص: ۴۳)

ایک دوسرے تابعی حضرت میمونؒ بن مہران نے فرمایا:

"علماء ان کے پاس آتے ہیں تو تھوڑی دیر بھی نہیں ہوتی کہ وہ ان کی شاگردی اختیار کر لیتے ہیں۔" (سیر اعلام النبلاء: ۵-۱۲۷)

خلیفہ ہونے سے پہلے وہ گورنر ہوئے تو گورنری نے بھی ان کو تعلیم حاصل کرنے سے باز نہ رکھا۔ پھر خلیفہ ہوئے تو خلافت کی ذمہ داریاں بھی ان کے شوق تعلیم میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔

اخلاص کی تربیت

ان کو یہ بات معلوم تھی کہ اعمال اس وقت مقبول ہوتے ہیں جب اخلاص کے ساتھ کئے جائیں۔ اس لئے وہ اپنے ہر قول وفعل کا شدید محاسبہ کرتے، اتنا شدید محاسبہ کہ غرور کے خوف کی وجہ سے زیادہ باتیں بھی نہ کرتے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۵/۱۲۷)

اللہ کو حاضر و ناظر سمجھنے کی تربیت

وہ جو کام بھی شروع کرتے اس یقین وشعور کا پہلے استحضار کر لیتے کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ اس لئے اپنا حق ہو یا غیروں کا اس میں کوتاہی پر اللہ کا خوف انھیں ہمیشہ لرزہ براندام رکھتا۔ مروی ہے کہ مال فے کا مشک وعنبر ان کے پاس آیا تو اسے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر فوراً اسے رکھ دیا اور جا کے وضو کیا تاکہ ہاتھ میں اس کی خوشبو کا اثر باقی نہ رہے۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، ص: ۳۶)

اس پر ان کے منشی نے ان کو ٹوکا کہ آخر وہ کون سی چیز تھی کہ جس کو ہاتھ لگایا تو آپ کو ہاتھ دھونا پڑا؟! انھوں نے جواب دیا: "تعجب ہے کہ تم اتنی سی بات بھی نہ سمجھ سکے۔ دیکھو وہ خوشبو تھی۔ کوئی کھانے کی چیز نہیں تھی۔ خوشبو آخر کس کام آتی ہے۔ لوگ خوشبو کو کپڑوں میں یا ہاتھ اور بدن میں لگاتے ہیں تو مال فے کی خوشبو میرے ہاتھ میں لگی تو کیا اس سے مرا انتفاع جائز تھا؟

(سیرۃ عمر بن عبد العزیز: ص: ۴۶)

اسی طرح کا ایک واقعہ یہ ہے کہ آپ کی بچی کے پاس ایک موتی تھا جس کو وہ بالی کے طور پر ایک کان میں استعمال کرتی تھی۔ اس کے جی میں یہ بات آئی کہ ایک موتی اور مل جاتا تو دونوں کانوں کی زینت ہو جاتی۔ انھوں نے اپنے والد سے درخواست کی کہ ایک موتی فراہم کر دیا جائے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس درخواست پر دو انگارے بھجوا دیئے اور کہلا بھیجا کہ اگر ان کو بالی کے طور پر استعمال کر سکیں تو مزید بھیج دوں۔

قیامت کے دن اللہ کی باز پرس کا ان کو اتنا خوف تھا کہ اپنی روز مرہ ضروریات میں بھی کشادگی کے بجائے کفایت شعاری یا تنگی سے کام لیتے۔ ان کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا تھا، اسی کو دھو دھو کے پہنتے تھے۔ اپنی اہلیہ کے تمام زیورات بیت المال (سرکاری خزانہ) میں جمع کر دیے۔ جب عامۃ المسلمین کا کام کرتے جو چراغ جلاتے، اس دوران اگر کسی دوسرے کام سے آ پڑتے تو چراغ گل کر دیتے۔ ان کو خوف تھا کہ مسلمانوں کے مصالح اور مفادات کے علاوہ دوسرے امور و معاملات کے لئے تیل صرف ہوا تو اللہ کے یہاں باز پرس ہوگی۔

تقویٰ کا یہ بلند مقام ان کو صرف اس وجہ سے حاصل ہوا کہ ان کو ہر لمحہ اس بات کا دھیان رہتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے اور قیامت کے دن ہر ہر بات اور ہر ہر عمل کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔

موت کی یاد

سلیمان بن عبد الملک کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے تو تھکان کی وجہ سے لیٹ گئے اور اعلان کرا دیا کہ لوگوں کے حقوق بعد میں ادا کئے جائیں گے۔ ان کے فرزند عبد الملک نے ان سے عرض کیا: آپ نے کس بنیاد پر یہ یقین کر لیا کہ لیٹنے کے بعد اٹھنے تک آپ بقید حیات ہی رہیں گے۔ یہ سننا تھا کہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اعلان کرا دیا کہ لوگ فوراً آ کے اپنے اپنے حقوق واپس لے لیں۔ کوفہ کی ایک خاتون اپنی کوئی ضرورت لے کر حاضر ہوئیں تو ان سے کہا کہ شام کو آئیں۔ پھر خود ہی کہا: عشاء کے وقت تک زندہ رہنے کا کیا بھروسہ؟ ایک بار ایسا ہوا کہ وہ خاتون آئیں تو ان کو ایک رقعہ دے کر اپنی اہلیہ کے پاس بھیج دیا۔ (سیرۃ عمر بن عبد العزیز، ص: ۴۵)

انکساری

اللہ کے لئے عاجزی اور فروتنی ان کا شیوہ تھا، اس لئے خلیفہ ہونے پر تعلی کا شکار نہ ہوئے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ کچھ لوگ کسی ضرورت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ

ان کے پاس رات کو قیام کیا۔ رات میں چراغ کی بتی خراب ہو گئی تو خود اٹھ کے اس کو درست کیا۔ لوگوں نے عرض کیا: امیر المومنین! آپ نے خود کیوں تکلیف کی؟ ہم کو حکم دیتے، ہم ٹھیک کر دیتے۔ آپ نے جواب دیا کہ میں نے ہی ٹھیک کر دیا تو کیا حرج ہو گیا؟ میں نے اٹھ کے ٹھیک کیا تب بھی عمر بن عبد العزیز ہی تھا اور ٹھیک کر کے واپس آیا تب بھی عمر بن عبد العزیز ہی ہوں۔ (سیرۃ عمر بن عبد العزیز، ص: ۴۶)

اپنے نفس کی اصلاح کا اتنا خیال اور اہتمام تھا کہ کوئی دوسرا آپ کا کوئی کام کر دے تو اس سے بچتے کہ کہیں یہ خیال دل میں نہ آ جائے کہ میں امیر المومنین ہوں اور میرے بلند مقام و مرتبہ کی وجہ سے لوگ میرے کام کر دیا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ چیز برتری کے احساس کو جنم دے گی جو غرور کا شاخسانہ ہے۔ ان کے سامنے رسول پاک کی یہ حدیث ہر وقت رہا کرتی تھی:

”جس کے دل میں ذرہ برابر غرور ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔“ (مسلم: ۹۱)

ہمارے دور کے علماء کا یہ حال ہے کہ جہاں تھوڑی شہرت و عزت ملی اور کچھ عقیدت مندوں کی بھیڑ جمع ہونی شروع ہوئی تو چھوٹے سے چھوٹا کام بھی خود نہیں کریں گے بلکہ دوسروں ہی کے منتظر رہیں گے۔

☆☆☆

”اسلام نے جو معاشرہ تیار کیا یہ اس کا شرف تھا کہ افریقہ کا بربر اور حجاز کا بدو ایک جان دو قالب ہو گئے اور ہندوستان کا اچھوت مشرف بہ اسلام ہو کر خاک طیبہ کے سادات سے منسلک ہو گیا۔ جب تک مسلمانوں کے معاشرے میں اس خصوصیت کی آب و تاب ماند نہ ہوئی اس کے سر پر کلاہ خسروی رہا اور دنیاوی عزتوں کے بہت سے خزانے مسلمانوں کے پاؤں میں ڈھیر ہوتے گئے۔ جوں ہی وہ اس سے دست بردار ہوئے اور انہوں نے شخصی شرف و مجد کے بت تراش لئے، ان کا معاشرہ اقوام عالم کے لئے عبرت کی ایک ایسی کہانی ہو گیا کہ آج دوسری کوئی داستان اس درجہ غم ناک نہیں ہے۔“ (مولانا ابوالکلام آزادؒ)

بچوں کو اغوا ہونے سے بچایئے

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ☆

آج کل ظلم وتعدی اور زیادتی کی جو قبیح صورتیں سماج میں جڑ پکڑتی جارہی ہیں، ان میں ایک بچوں کا اغوا بھی ہے۔ معصوم بچوں کو اٹھایا جاتا ہے اور ان کی رہائی کے لئے منھ مانگی رقم طلب کی جاتی ہے۔ اس طرح چوری اور ڈکیتی کی مانند اسے بھی پیسہ کمانے کا ایک حربہ بنایا گیا ہے۔ ملک کی راجدھانی دلی کو اس سلسلے میں خصوصی امتیاز حاصل ہے اور آئے دن وہاں اغوا کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ جب بھی اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آتا ہے، ہلچل سی مچ جاتی ہے، اخبارات ورسائل ہوں یا الیکٹرانک میڈیا، ہر جگہ اس واقعے کی گونج سنی جاسکتی ہے۔ قوم ومذہب اور علاقہ ووطن کی تفریق سے اوپر اٹھ کر تمام ہی لوگ ایسے واقعات پر ملول اور بے قرار ہوجاتے ہیں اور ایسا ہونا فطری بات ہے، کیوں کہ بچے معصوم پھول ہوتے ہیں، پھول اگر کیچڑ میں ہو تب بھی محبوب ہوتا ہے۔ اسی طرح بچے امیر کے ہوں یا غریب کے، ان کی معصومیت، بھولاپن اور دل کو لبھانے والی ان کی حرکتیں ہر ایک کو عزیز ہوتی ہیں۔

لیکن اغوا کا ایک اور طریقہ بھی ہے، جس کی طرف لوگوں کا ذہن عموماً نہیں جاتا، جہاں لوگ خود اپنے بچوں کو اغوا کاروں کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں اور التجائیں کر کر کے انہیں قبول کر لینے پر آمادہ کرتے ہیں، اس میں اگرچہ بچے کی جان کا خطرہ نہیں ہوتا، اغوا کاروں کی طرف سے رقم تو اچھی خاصی لی جاتی ہے مگر زور زبردستی کے ساتھ نہیں، بلکہ ایسی محبت کے ساتھ کہ جیسے نذرانۂ عقیدت پیش کیا جارہا ہو، اس میں اغوا بچوں کے ایمان اور ان کے عقیدے کا ہوتا ہے، اس میں جسم وجان کے بجائے دل ودماغ کا اغوا کیا جاتا ہے، اس میں مال وزر کے بجائے فکر ونظر کا تاوان وصول کیا جاتا ہے، اس میں دل کے ٹکڑے ماں باپ کی نگاہ محبت سے محروم نہیں کئے جاتے، بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی معرفت سے محروم کئے جاتے ہیں، اس میں جسمانی موت کا خطرہ تو نہیں ہوتا، لیکن

☆ المعہد العالی، حیدرآباد

روحانی موت کا خطرہ ضرور ہوتا ہے، مگر یہ اغوا کی ایسی صورت ہے کہ نہ اس پر دل لرزتے ہیں، نہ دماغ بے سکون ہوتا ہے، نہ زبان پر آہ وفغاں ہوتی ہے، نہ گھر میں کوئی کہرام مچتا ہے اور نہ سماج میں کوئی ہلچل پیدا ہوتی ہے، بلکہ مسرتوں اور خوشیوں کے سائے میں اغوا کی یہ کارروائی انجام کو پہنچتی ہے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ اغوا کی یہ کیا صورت ہے جو جبر ودباؤ کے بجائے رضا ورغبت کے ساتھ عمل میں آتی ہے، جس کے لئے معصوم بچوں کے والدین خود روپے نثار کرتے ہیں اور مرکے مل چل کرا پنی اولاد کا نذرانہ پیش کرتے ہیں؟ یہ اغوا شدہ بچے وہ نونہالانِ قوم ہیں جنہیں ایسی درسگاہوں میں داخل کیا گیا ہے جہاں اللہ اور رسول کا کوئی ذکر نہیں، جہاں آخرت کا کوئی تصور نہیں، جس میں اخلاقیات کو از کار رفتہ خیالات کا درجہ دیا جاتا ہے، جہاں مخلوط تعلیم اور لڑکیوں کے لئے کھلی ہوئی ٹانگوں پر مشتمل یونیفارم کو تہذیب وشائستگی کی علامت باور کیا جاتا ہے۔ اگر یہ درسگاہیں عیسائی مشنریز کے زیر اہتمام ہیں تو بچے مسیح علیہ السلام کی تصویر کے سامنے کھڑے ہوکر دعا کرتے ہیں اور اگر ہندو انتہا پسند تنظیموں سے قربت ہے تو وندے ماترم کا ترانہ پڑھایا جاتا ہے اور ان کے عقیدے کے مطابق علم کی دیوی سرسوتی جی پر پھول بھی چڑھائے جاتے ہیں۔ غرض ہر درجہ بچوں کو ان کے اپنے مذہبی عقائد سے مانوس کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ اس طرح پڑھائی جاتی ہے کہ مسلمان سلاطین گویا غارت گروں کا ایک گروہ تھا، انہوں نے ملک کی تعلیم وترقی کے لئے تو کوئی کام نہیں کیا، البتہ اپنی عیش کوشی اور عشرت سامانی کے ایک سے ایک سامان کئے اور لوگوں پر ظلم وستم اور جور وجفا کے پہاڑ ڈھائے۔

اس کے علاوہ موقع بہ موقع مسلمان طلبہ وطالبات کو احساس کمتری میں بھی مبتلا کیا جاتا ہے کبھی انہیں دہشت گردی کا طعنہ دیا جاتا ہے، کبھی پیغمبر اسلام ﷺ کو نشانہ بنایا جاتا ہے، کبھی طلاق اور تعدد ازدواج کا مسئلہ اٹھایا جاتا ہے، کبھی پردہ اور نقاب پر تنقید کی جاتی ہے، عورتوں کے تئیں اسلامی تعلیمات کو ناانصافی پر مبنی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ مضامین چاہے کتاب میں لکھی ہوئی حالت میں موجود نہ ہوں، لیکن سبق کے دوران استاذ اسے وقتاً فوقتاً طلبہ کے ذہن میں ڈالتا رہتا ہے اور درسگاہ کے پورے ماحول میں یہ سوالات ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ مسلمان طلبہ وطالبات اپنے آپ کو بے بس اور تحت احساس کمتری کا شکار پاتے ہیں۔ یہ محض فرضی واقعات اور امکانی سوالات نہیں ہیں بلکہ غیر مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والی کسی بھی تعلیم گاہ کے دو چار مسلمان بچوں کو اگر آپ کریدنے کی کوشش کریں تو وہ اس کڑوی حقیقت کو آپ کے سامنے اگل دیں گے۔ اگر کبھی کسی کم ظرف شخص کی

دریدہ ذہنی کی وجہ سے بات اسکول کے ماحول سے باہر آجاتی ہے تو لوگوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں کی طرف سے ردعمل کا مظاہرہ ہوتا ہے، لیکن اس ردعمل کی حیثیت ایک ایسی ناپائیدار آندھی کی ہے جو زور وشور کے ساتھ آئے اور لمحوں میں گزر جائے۔

ان تعلیم گاہوں سے تعلیم پاکر جو مسلمان بچے باہر آتے ہیں، ان میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو صرف نسلی مسلمان ہوتے ہیں، لیکن شاید شعوری طور پر مسلمان نہیں ہوتے۔ ابھی چند سال پہلے ٹی وی کے مقبول ترین پروگرام ”کون بنے گا کروڑ پتی“ میں عرفان نامی لڑکا رسول اللہ ﷺ کا مبارک نام بھی نہیں بتا سکا اور معروف ماہر تعلیم جناب سید حامد (چانسلر ہمدرد یونیورسٹی نئی دہلی) کے چشم دید بیان کے مطابق IAS میں کامیاب ہونے والی ایک طالبہ یہ تک نہیں بتا سکی کہ معراج سے کیا مراد ہے اور کیا اس عنوان سے سیرت کا کوئی واقعہ معروف ہے؟ یہ افسوس ناک مثالیں منظر عام پر آگئیں، ورنہ تو مسلمانوں کی نئی نسل میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اگر مسلمانوں نے اس صورت حال کی طرف توجہ نہیں کی اور اس کے سد باب کو نہیں سوچا تو ان کی نسلوں کو ذہنی طور پر اغوا کرلیا جائے گا اور وہ اسے محسوس بھی نہیں کرسکیں گے۔ ان کا نسبی رشتہ آباواجداد سے ضرور قائم رہے گا، لیکن ان کا فطری رشتہ آپ ﷺ سے کٹ چکا ہوگا۔ اللہ اور رسول کی نسبت سے ”علم اطاعت“ اٹھانے کے بجائے ”علم بغاوت“ ان کے ہاتھوں میں ہوگا اور یہی غفلت ہماری صفوں سے سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین اور حمید دلوائی جیسی خدا بیزار اور اسلام دشمنوں کو جنم دے گی۔

بچوں کا ذہن سادہ بلیک بورڈ کی طرح ہے۔ والدین اس پر جو لکھ دیں وہ نقش ہو جائے گا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے بچوں کی تعلیم وتربیت کو بے حد اہمیت دی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ما ورث والد والدا خیرا من ادب حسن (مجمع الزوائد: ۸/۱۰۵-۱۰۶) ”کسی باپ نے اپنے بیٹے کو اچھی تربیت سے بہتر چیز نہیں دی“۔

بچے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کے کان میں اذان واقامت کہلائی جاتی ہے اور حدیث میں تلقین کی گئی ہے کہ بچوں کو پہلے اللہ کا نام اور کلمۂ طیبہ سکھایا جائے۔ ان سب کا منشا یہی ہے کہ اللہ تعالی کی معرفت اس کے رگ وریشہ میں سما جائے۔

اپنے بچوں کو شعوری طور پر مسلمان باقی رکھنے اور احساس کم تری اور مرعوبیت سے محفوظ رکھنے کے لئے چند باتیں ضروری ہیں:

☆ مسلمان خود معیاری اسکول قائم کریں۔ یہ اسکول مالی اعتبار سے ”نہ نفع اور نہ نقصان“

[illegible] پر چلائے جائیں۔ ان اسکولوں کی توجہ فلک بوس عمارتوں کے بجائے افراد کی تعمیر پر ہو اور ایسے وسائل تعلیم کو فروغ اور معیاری بنانے پر خرچ کیا جائے۔ ان اسکولوں کا ماحول شریعت کی مقرر کردہ حدود سے ہم آہنگ ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ اسکول کو مدرسہ بنایا جائے اور ان کے لئے ایسا نظام مقرر کیا جائے کہ وہ کسی دینی درسگاہ کے طالب علم محسوس ہوں، بلکہ شاید ایسا کرنا مناسب بھی نہ ہو، کیوں کہ ایسی سخت گیر تربیت سے وہی بچے اسکول میں آسکیں گے جو پہلے سے پختہ دینی ذہن رکھتے ہوں یا اہل دین اور ارباب صلاح سے قریب ہوں، ایسے بچوں کے لئے تو گھر کا ماحول بھی دین پر قائم رہنے میں معاون ہوتا ہے۔ اصل مسئلہ ان بچوں کا ہے جن کے یہاں پہلے سے دینی مزاج وماحول موجود نہ ہو، اس لئے یہ بات کافی ہے کہ طلبہ کا یونیفارم شرعی حدود کے دائرے میں ہو اور اسکول کا عمومی ماحول اسلامی ہو، اساتذہ کی ایسی تربیت ہو کہ خواہ وہ کوئی بھی مضمون پڑھائیں لیکن اس کے ضمن میں اسلام کی عظمت دلوں میں بٹھاتے جائیں۔

☆ اردو میڈیم اسکولوں کو تقویت پہنچائی جائے، کیوں کہ زبان بجائے خود ایک تہذیب ہوتی ہے۔ اردو پڑھنے والے بچے ایک عظیم الشان اسلامی ورثے سے جڑ جاتے ہیں۔ یہ تعلق ان میں اسلامی فکر کو پروان چڑھاتا ہے اور اسلامی تہذیب کے رنگ میں ان کو رنگ دیتا ہے۔

☆ اس سلسلے میں ایک بہت بڑی ضرورت بنیادی دینی تعلیم کے مکاتب کی ہے۔ یہ مکاتب ناظرہ قرآن پڑھانے اور کچھ دعائیں یاد کرانے تک محدود نہ ہوں، بلکہ منتخب آیات و احادیث کے ترجمے، رسول اللہ ﷺ کی مختصر سیرت اور آپ ﷺ کے اخلاقی واقعات، مسلمانوں کی تاریخ، علمی اور تمدنی طریقے میں مسلمانوں کا حصہ، ہندوستان کی تعمیر وترقی اور آزادی میں مسلم حکمرانوں کی خدمات جیسے اہم موضوعات کا بھی احاطہ کرتی ہو۔ مسلمانان گجرات کا انتظام مکاتب اس سلسلے میں ایک نمونہ اور آئیڈیل کا درجہ رکھتا ہے، انہوں نے یورپ میں بھی اپنے اس انتظام کو پورے انضباط اور اہتمام کے ساتھ قائم رکھا ہے، جس کے گہرے اثرات نمایاں طور پر محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

☆ مغربی ملکوں میں ہفتہ واری دینی کلاسیز کا مفید سلسلہ جاری ہے، جس میں ہفتہ اور اتوار کو مسلمان طلبہ وطالبات کی دینی تعلیم کا وسیع اور ہمہ گیر نظم کیا جاتا ہے، ان کلاسوں سے انہیں احکام دین کے سلسلے میں اچھی خاصی واقفیت ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی منظم طور پر اسے رواج دینے کی ضرورت ہے اور مسجد کی شکل میں ہمارے پاس اس کے لئے مطلوب بنیادی انفراسٹرکچر

موجود ہے۔

☆ اپریل سے لے کر جون تک ملک کے مختلف حصوں میں تعلیم گاہوں میں گرمائی تعطیلات ہوتی ہیں۔ یہ تعطیل کم وبیش پچاس دن پر مشتمل ہوتی ہے۔ پچاس دنوں کا وقت کچھ کم نہیں ہے۔ اگر صحیح طور پر اس وقت کا استعمال ہو، تمام حالات کو مدنظر رکھ کر طلبہ وطالبات کی عمر کے لحاظ سے اس پچاس روزہ مدرسہ کا نصاب مقرر کیا جائے اور باضابطہ طریقے پر تعلیم وتربیت کی جائے تو اس سے بھی بڑا فائدہ ہوسکتا ہے۔ الحمد للہ اس وقت گرمائی کلاسز کا ایک مفید سلسلہ چل پڑا ہے، لیکن زیادہ تر کلاسز چند سورتوں اور دعاؤں کے یاد دلانے تک محدود ہوتے ہیں، یقیناً ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس وقت مسلمانوں کی نئی نسل پر جو فکری یلغار ہورہی ہے اس کے مقابلے کے لیے صرف اتنی ہی تعلیم کافی نہیں۔

موسم گرما سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف دینی جماعتیں اور تنظیمیں بھی اپنے پروگرام چلاتی ہیں۔ نوجوانوں کو ان سے وابستہ کرنا نہایت ہی مفید ہے، اس سے نہ صرف ان کی ذہنی تربیت ہوتی ہے بلکہ ان کو سلیم الفکر دوستوں کا ماحول مل جاتا ہے اور یہ رفاقت انہیں صراط مستقیم پر قائم رکھتی ہے، دینی اعتبار سے ان میں پختگی پیدا ہوجاتی ہے اور ان کے پھسلنے کے اندیشے کم ہوجاتے ہیں۔

اگر ہمیں اپنی نسلوں کے ایمان کو بچانا ہے اور عالمی سطح پر ان کو اغوا کرنے کی جو کوشش کی جارہی ہے اس سے محفوظ رکھنا ہے تو ہمیں اس طرح کی تدبیروں کو اختیار کرنا ہوگا۔

☆☆☆

> ”بدبختی یہ ہے کہ ہمارے اعمال کی صورتیں مسخ نہیں ہوئیں مگر حقیقت غارت ہوگئی ہے۔ قومی تنزل کے معنی یہی ہیں کہ تمام قومی ودینی اشغال بظاہر قائم رہتے ہیں، لیکن ان کی روح مفقود ہوجاتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہماری مسجدیں اجڑ گئی ہوں، کتنے فانوس ہیں جن سے مسجدیں بقعۂ نور بنائی جاتی ہیں، مگر رونا یہ ہے کہ دل اجڑ گئے ہیں اور یہ وہ بستی ہے جب ویران ہوجائے تو پھر آبادی کہاں!!“
>
> (مولانا ابوالکلام آزادؒ)

دینی مدارس میں تدریس قرآن کا مطلوبہ منہاج

(آخری قسط)

اعجاز احمد قاسمی ☆

ماخذ تفسیر

نمائندہ دینی مدارس کے مناہج کا مختصر جائزہ پیش کرنے کے بعد اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مطلوبہ منہاج کی نشاندہی اور اس کے لئے تجاویز ومشورے پیش کرنے سے پہلے تفسیر کے بنیادی ماخذ بیان کردیے جائیں اور ساتھ ہی تفہیم قرآن کے معاون ذرائع اور وسائل بھی کسی حد تک واضح کردیے جائیں تاکہ ان کی روشنی میں مطلوبہ منہاج تک رسائی آسان ہوجائے۔

تفسیر کے ماخذ بیان کرنے سے قبل یہ عرض کردینا مناسب ہے کہ قرآنی آیات دوطرح کی ہیں بعض آیات اتنی صاف اور واضح ہیں کہ عربی زبان سے واقفیت رکھنے والا جو شخص بھی انہیں پڑھے گا ان کا مطلب سمجھ لے گا، ایسی آیات کی تفسیر کا ماخذ صرف ”لغت عرب“ ہے، ایسی آیات کا مفہوم سمجھنے کے لئے عربی زبان پر عبور اور عقل سلیم کافی ہے، اس کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ (۱۰)

دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جو مجمل، مبہم یا محتاج تشریح ہیں یا ان سے دقیق قانونی مسائل یا گہرے اسرار ومعارف مستنبط ہوتے ہیں یا ان کے حقیقی مفاہیم تک رسائی کے لئے ان کے پس منظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے، ایسی آیات کی تفسیر کے لئے صرف عربی زبان سے واقفیت کافی نہیں بلکہ اس کے لئے مختلف علوم پر گہری نظر ضروری ہے۔

ذیل میں اسی دوسری قسم کی آیات کے تفسیری ماخذ درج کئے جارہے ہیں:

۱۔ بذات خود قرآن کریم   ۲۔ صحیح تفسیری روایات   ۳۔ اقوال صحابہ

۴۔ لغت عرب   ۵۔ عقل سلیم

ماخذ اول۔ قرآن کریم

تفسیر قرآن کا پہلا ماخذ خود قرآن کریم ہے یعنی اس کی آیات بعض اوقات ایک دوسرے

☆ استاذ حدیث وفقہ جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

کی تفسیر کر دیتی ہیں، ایک جگہ کوئی بات مبہم انداز میں کہی جاتی ہے اور دوسری جگہ اس ابہام کو رفع کر دیا جاتا ہے، مثلاً سورہ فاتحہ میں ارشاد ہے:

اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم (الفاتحه: ۵-۶)

"ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کیجئے، ان لوگوں کے راستے کی جن پر آپ نے انعام فرمایا"

یہاں یہ بات واضح نہیں کی گئی ہے کہ جن لوگوں پر انعام فرمایا گیا ہے، ان سے کون لوگ مراد ہیں؟ لیکن دوسری جگہ ارشاد ہے:

فاولئك الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين (النساء: ۶۹)

"یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور نیک لوگ"

اسی طرح ایک آیت میں ارشاد ہے:

فتلقى آدم من ربه كلمات فتاب عليه (البقره: ۳۷)

"پس آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔"

لیکن یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ کلمات کیا تھے؟ دوسری جگہ ان کلمات کی وضاحت فرما دی گئی، ارشاد خداوندی ہے:

قالا ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين (الاعراف: ۲۳)

"انہوں نے (آدم وحوا نے) کہا کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر آپ نے ہماری مغفرت نہ کی اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔"

(۲) تفسیر القرآن بالقرآن کی دوسری شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی بات اس کی ایک قرأت میں مبہم ہوتی ہے اور دوسری قرأت سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے، مثلاً ایک قرأت میں وضو کا طریقہ بتاتے ہوئے قرآن کریم کا ارشاد ہے:

فاغسلوا وجوهكم وايديكم الى المرافق وامسحوا برؤسكم وارجلكم الى الكعبين (المائده: ۶)

عربی قواعد کی رو سے اس کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ:

"تم اپنے چہروں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو اور اپنے سروں کا مسح کر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھولو"

اور اس کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ:

"اپنے سروں اور پاؤں کا مسح کر لو"

لیکن دوسری قرأت میں "وارجلكم" کے بجائے "وارجلكم" آیا ہے، اس قرأت میں اس کے سوا کوئی ترجمہ نہیں ہو سکتا کہ "اپنے پاؤں دھولو" لہٰذا اس قرأت نے یہ واضح کر دیا کہ پہلی قرأت میں بھی پاؤں دھونے ہی کا حکم دیا گیا ہے اور اس میں مسح کرنے کا جو ترجمہ ہو سکتا ہے وہ مراد نہیں۔

(۳) تفسیر القرآن بالقرآن کی تیسری صورت یہ ہے کہ جس آیت کی تفسیر مطلوب ہے خود اس کے سیاق وسباق (Context) پر غور کیا جائے، اس طرح بسا اوقات آیت کے کسی حل طلب مسئلہ کی تشریح واضح ہو جاتی ہے، مثلاً سورہ احزاب میں امہات المومنین سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے:

وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى (الاحزاب: ۳۳)

"اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق بے پردہ مت پھرو۔"

بعض اصول شرعیہ سے ناواقف لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ یہاں خطاب ازواج مطہرات کو ہو رہا ہے یہ دعویٰ کر دیا کہ پردے کا حکم صرف ازواج مطہرات ہی کے ساتھ مخصوص تھا، عام عورتوں کے لئے اس پر عمل ضروری نہیں، لیکن خود قرآن کریم کا سیاق وسباق اس دعوے کی تردید کر رہا ہے، اسی آیت کے آگے پیچھے ازواج مطہرات سے خطاب کرتے ہوئے اور بھی کئی احکام مذکور ہیں وہ یہ ہیں کہ: بولنے میں نزاکت سے کام نہ لو، نیک بات کہو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، ان احکام میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں کوئی معقول آدمی یہ کہہ سکے کہ یہ صرف ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسری عورتوں پر عمل ضروری نہیں، لہٰذا ان بہت سے احکام کے بیچ میں سے صرف ایک جملے کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ عام عورتوں کے لئے نہیں ہے، دوسری آیات قرآنی اور احادیث نبویہ وغیرہ کے علاوہ خود قرآن کریم کے سیاق وسباق کے بھی بالکل خلاف ہے۔(۱)

علامہ فہد بن عبدالرحمن الرومی اپنی بے نظیر تصنیف "اصول التفسير ومناهجه" میں اس اولین ماخذ کے بارے میں فرماتے ہیں:

وهو اصح طرق التفسير ، قال ابن تيمية رحمه الله تعالى: ''اصح الطرق في ذلک ان يفسر القرآن بالقرآن، فما اجمل في مكان فانه قد فسر في موضع آخر، وما اختصر في مكان فقد بسط في موضع آخر.''

فعلى من أراد أن يفسر القرآن أن ينظر في آيات القرآن الأخرى و يجمع الآيات ذات الموضوع الواحد، فان ما أجمل في موضع قد يبين في موضع آخر، وما أشكل في موضع قد يوضح في موضع آخر، وماجاء في آيات مطلقاقد يقيد في آيات أخرى، وماورد عاما قد يدخله التخصيص في آيات أخرى، وماجاء موجزا في موضع قد يفصل في موضع آخر (۱۲)

''یعنی تفسیر القرآن بالقرآن تفسیر کا صحیح ترین طریقہ ہے، ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ''اس مسئلے میں صحیح ترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعہ کی جائے، کیوں کہ جو بات ایک جگہ مجمل ہے دوسری جگہ وہ مفسّر ہے اور ایک جگہ جو بات مختصر ہے دوسری جگہ وہ مفصل ہے۔

لہٰذا جو قرآن کی تفسیر کرنا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کی دوسری آیات پر نگاہ رکھے اور ایک موضوع کی تمام آیات کو جمع کرلے، کیونکہ جو بات ایک جگہ مجمل ہے دوسری جگہ اس کی وضاحت کردی گئی ہے، ایک جگہ جو بات مشکل ہے دوسری جگہ اس کے اشکال کو رفع کردیا جاتا ہے، ایک آیت میں جو چیز مطلق ہے دوسری آیات میں وہ مقید ہے، جو بات ایک جگہ عام ہے دوسری آیات میں اس میں تخصیص پیدا کردی جاتی ہے، ایک جگہ جو بات مختصر انداز میں ہے دوسری جگہ اس کی تفصیل بیان کردی گئی ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن کی مثالیں بیان کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

وقوله تعالى:''احلت لكم بهيمة الانعام الا ما يتلى عليكم''(سورة المائدة من الآية الاولى) فسرتها آية ''حرمت عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما أهل لغير الله به والمنخنقة والمتردية''(سورة المائده : ۳)

وقد ورد نفي الخلة و الشفاعة يوم القيامة بقوله تعالى''يايها الذين آمنوا انفقوا مما رزقناكم من قبل ان ياتي يوم لا بيع فيه ولا خلة ولا شفاعة والكافرون هم الظالمون''(سورة البقرة: ۲۵۴) وقد استثنى من الخلة خلة المتقين في قوله تعالى:''الاخلاء يومئذ بعضهم لبعض عدو الا المتقين''(سورة الزخرف: ۶۷)

واستثنى من الشفاعة ما أذن الله به منها ''وكم من ملك في السماوات لاتغني شفاعتهم شيئا الا من بعد أن ياذن الله لمن يشاء و يرضى''(سورة النجم: ۲۶)(۱۳)

عبارت مذکورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ سورہ مائدہ کی پہلی آیت میں ''محرمات'' مجمل ہیں لیکن آیت ۳ میں ان کی وضاحت کردی گئی ہے، اسی طرح سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۴ میں مطلقاً خلہ اور شفاعہ کی نفی کی گئی ہے لیکن سورہ زخرف کی آیت ۶۷ میں اہل تقویٰ کی دوستی کا اور سورہ نجم کی آیت ۲۶ میں ماذون لہ باالشفاعۃ کی شفاعت کا استثناء کردیا گیا ہے۔

علامہ محمد بن جمیل زینو اپنی کتاب ''كيف تفهم القرآن'' میں اس اولین ماخذ کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

ان تفسير القرآن بالقرآن هو اعلى انواع التفسير، فالقرآن يفسر بعضه بعضا مثال ذلک قوله تعالى:

والسماء والطارق، وما أدراک ما الطارق، النجم الثاقب (سورة الطارق: ۱ – ۳) فالنجم الثاقب تفسير لكلمة الطارق

ومثال آخر قوله تعالى:

الا ان أولياء الله لاخوف عليكم و لا هم يحزنون (يونس: ۶۲)

فقد فسر الاولياء الله بقوله ''الذين آمنوا و كانوا يتقون''(يونس: ۶۳)

اقول: وفي هذا التفسير رد على القائلين بأن الولي: هو الذى يعلم الغيب او تكون له كرامات، او له قبة على قبره او غير ذلک من الاعتقادات الباطلة، فكل مومن بالله يطيع اوامره، ويتقي محارمه فهو من أولياء الله، والكرامة ليست شرطاً فقد تظهر و قد تختفي.

ومثال آخر: عن عبدالله بن مسعود رضي الله عنه قال لما نزلت:

الذين آمنوا ولم يلبسوا ايمانهم بظلم (سورة الانعام: ۸۲)

شق ذلک على المسلمين، قالوا: أينا لايظلم نفسه؟ فقال رسول الله ﷺ: ليس ذلک، انما هو الشرک، الم تسمعوا قول لقمان لابنه: يابني لاتشرک بالله ان الشرک لظلم عظيم (لقمان: ۱۳) متفق عليه (۱۴)

عبارت مذکورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر القرآن بالقرآن تفسیر کی سب سے اعلیٰ اور ارفع قسم ہے، کیونکہ قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کیا کرتی ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سورہ طارق کی پہلی آیت میں طارق سے کیا مراد ہے؟ دوسری آیت میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ سورہ یونس کی آیت ۶۲ میں 'اولیاء اللہ'' سے کون لوگ مراد ہیں؟ اگلی آیت میں اس کو واضح کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان اور تقویٰ والے ہوں وہ اولیاء اللہ ہیں۔

فاضل مصنف فرماتے ہیں کہ اس تفسیر کے ذریعہ ان لوگوں کی تردید ہو جاتی ہے جن کا خیال یہ ہے کہ ولی وہ شخص ہے جسے غیب کا علم ہو یا جس سے کرامتیں صادر ہوتی ہوں یا جس کی قبر پر گنبد بنا ہوا ہو، اس تفسیر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہر وہ شخص جس کا اللہ پر ایمان ہے اس کے اوامر کو بجا لاتا اور محارم سے اجتناب کرتا ہے وہ اولیاء اللہ میں داخل ہے، ولایت کے لئے کرامت کا ظہور شرط نہیں ہے، کرامت ظاہر بھی ہو سکتی ہے اور نہیں بھی۔

تیسری مثال یہ ہے کہ بقول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب سورہ انعام کی آیت ۸۲ نازل ہوئی تو صحابہ کرام پریشان ہو گئے، انہوں نے اللہ کے رسول سے عرض کیا کہ ہم میں سے کون شخص ایسا ہے جو اپنی جان پر ظلم نہ کرتا ہو، حضور اکرم ﷺ نے اس اشکال کو دور کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ معنی مراد نہیں بلکہ اس سے مراد شرک ہے اور استشہاد میں سورۂ لقمان کی آیت پیش فرمائی جس میں شرک کو ظلم عظیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ماخذ دوم - احادیث نبویہ

تفسیر قرآن کا دوسرا ماخذ آنحضور ﷺ کی احادیث ہیں، قرآن کریم نے متعدد مقامات پر یہ واضح کیا ہے کہ آنحضور ﷺ کو اس دنیا میں مبعوث کئے جانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپ اپنے قول و فعل سے آیات قرآنی کی تفسیر فرمائیں، چنانچہ سورہ نحل میں ارشاد ہے:

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم (سورہ النحل ۴۴)

''اور ہم نے قرآن آپ پر اس لئے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان فرما دیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہیں۔''

اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے کہ آپ کا مقصد بعثت یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی توضیح فرمائیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وما انزلنا علیک الکتب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ وھدی ورحمۃ لقوم یومنون (سورۃ النحل: ۶۴)

''اور ہم نے آپ پر کتاب نہیں اتاری مگر اس لئے کہ آپ لوگوں کو وہ باتیں کھول کھول کر بتا دیں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور تا کہ یہ کتاب ایمان والوں کے لئے ہدایت و رحمت کا سبب ہو۔''

ان کے علاوہ اور بھی متعدد آیات ہیں جن سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کا مقصد بعثت ہی یہ تھا کہ آپ دنیا والوں کو قرآن کریم کی ہدایات اور اس کے اسرار و معارف سے آگاہ کریں اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھائیں، اس لئے خود قرآن کریم سے ہی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آپ کی تعلیمات تفسیر قرآن کا اہم ترین ماخذ ہیں۔ (۱۵)

علامہ رومی نے اس سلسلے میں ذرا تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے، وہ رقمطراز ہیں کہ تفسیر قرآن کا دوسرا مصدر و ماخذ سنت نبویہ ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ اگر قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعہ مشکل ہو تو سنت کو لازم پکڑ لو، کیونکہ سنت قرآن کی شارح اور اس کی وضاحت کرنے والی ہے، بلکہ امام شافعیؒ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول کا ہر فیصلہ قرآن کا مفہوم ہے۔

اور امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ سنت قرآن کی تفسیر اور تشریح کرتی ہے۔

البتہ یہ درست ہے کہ احادیث کے موجودہ ذخیرے میں صحیح و سقیم ہر طرح کی روایات ملتی ہیں، لہٰذا جو روایت جہاں مل جائے اسے پڑھ کر کوئی فیصلہ کر لینا درست نہیں، بلکہ اصول حدیث کے مطابق اسے اچھی طرح جانچنے کی ضرورت ہے کہ وہ ان اصولوں پر پوری اترتی ہے یا نہیں، خاص طور سے تفسیر کی کتابوں میں جو روایات ملتی ہیں ان کی چھان پھٹک اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ بیشتر مفسرین نے اپنی کتابوں میں ہر طرح کی روایتیں صرف جمع کر دی ہیں، محدثانہ طریقہ پر ان کی تحقیق و تفتیش نہیں کی ہے، لہٰذا ان روایات سے کما حقہ استفادہ وہی شخص کر سکتا ہے جو علم حدیث اور اس کے متعلقات پر ماہرانہ نگاہ رکھتا ہو اور جسے صحیح و سقیم روایات کو پرکھنے کے اصول معلوم ہوں۔ (۱۷)

ٹھیک یہی بات علامہ رومی نے بھی لکھی ہے، وہ رقمطراز ہیں:

''یہ بات ہمارے علم میں ہونی چاہئے کہ واضعین حدیث نے تفسیر کے سلسلے میں بہت ساری حدیثیں گھڑ کر آنحضور ﷺ کی طرف منسوب کر دی ہیں لہٰذا اس سلسلے میں روایات کی چھان بین اور آنحضور ﷺ کی جانب نسبت کی صحت کی تحقیق ضروری ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ حفاظت

کی تکمیل کے لیے محقق علماء کو پیدا کیا اور اپنی خاص مدد، توفیق اور ہدایت سے ان کو نوازا۔"

سنت نبویہ نے قرآن مجید کی تفسیر و توضیح مختلف انداز میں کی ہے مثلاً مجمل قرآنی کی تبیین، مشکلات قرآنیہ کی توضیح، عام قرآنی کی تخصیص اور مطلق قرآنی کی تقیید۔

علامہ رومی نے ہر صورت کی الگ الگ مثال بیان فرمائی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

فمن الاول: بیان مواقیت الصلوٰۃ، وعدد رکعاتہا وکیفیتہا وبیان مقادیر الزکوٰۃ واوقاتہا، وانواعہا وبیان مناسک الحج وکیفیۃ ادائہا.

ومن الثانی: تخصیص الظلم فی قولہ تعالیٰ: الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم، فہو ظلم عام الا انہ خصص بقول الرسول ﷺ بانہ الشرک.

ومن الثالث: تفسیر الخیط الأبیض و الخیط الأسود بانہ بیاض النہار وسواد اللیل.

ومن الرابع: تقییدہ الید فی قولہ تعالیٰ: "فاقطعوا أیدیہما" (المائدہ: ۳۸) بالیمین وانہ الی مفصل الکف. (۱۹)

عبارت کا مفہوم واضح ہے اس لئے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔

علامہ محمد بن جمیل زینو اس ماخذ ثانی کے بارے میں رقمطراز ہیں:

ان تفسیر القرآن بالحدیث الصحیح مہم جدا لأن الرسول ﷺ أعلم بمراد اللہ من غیرہ من الناس جمیعاً فہو کما قال اللہ تعالیٰ عنہ:

وما ینطق عن الہوی، ان ہو الا وحی یوحی (النجم: ۳-۴)

مثال ذلک قولہ تعالیٰ:

للذین أحسنوا الحسنیٰ وزیادۃ (یونس: ۲۶)

فقد فسر النبی صلی اللہ علیہ وسلم الزیادۃ بالنظر الی وجہ اللہ تعالیٰ (رواہ مسلم) (۲۰)

ماخذ سوم- اقوال صحابہؓ

آنحضور ﷺ کی احادیث کے بعد تفسیر قرآن کا تیسرا اہم ماخذ ان صحابۂ کرام کے اقوال ہیں جنھوں نے قرآن کی تعلیم براہ راست آنحضور ﷺ سے حاصل کی، ان میں سے بعض حضرات نے اپنی پوری زندگیاں اسی کام کے لئے وقف کی ہوئی تھیں کہ قرآن کریم، اس کی تفسیر اور متعلقات کو

براہ راست آپ کے اقوال و افعال سے حاصل کریں، یہ حضرات اہل زبان بھی تھے اور نزول قرآن کے احوال سے پوری طرح باخبر بھی، لیکن انھوں نے اپنی زبان دانی پر بھروسہ کرنے کے بجائے قرآن کریم کو سبقاً سبقاً آپ سے پڑھا، امام ابو عبدالرحمٰن سلمی مشہور تابعی ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"صحابۂ کرام میں سے جو حضرات قرآن کریم کی تعلیم دیا کرتے تھے مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ، انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ جب آپؐ سے دس آیتیں سیکھتے تو ان سے اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کی تمام علمی اور عملی باتوں کا علم حاصل نہ کر لیں۔"

علامہ رومی اس ماخذ کے متعلق فرماتے ہیں:

"تفسیر قرآن کا تیسرا مصدر و ماخذ تفسیر صحابہؓ ہے، علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ جب کسی آیت کی تفسیر قرآن و سنت میں نہ ملے تو اقوال صحابہؓ کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ اپنے قرائن و احوال کی وجہ سے اس سلسلے میں زیادہ واقف ہیں، نیز انہیں منجانب اللہ فہم تام اور علم صحیح سے بھی نوازا گیا تھا خاص طور پر علماء صحابہ اور کبار صحابہؓ۔" (۲۰)

البتہ اس سلسلے میں بھی چند امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

۱- صحابۂ کرام کے تفسیری اقوال میں بھی صحیح وسقیم ہر طرح کی روایتیں ملتی ہیں، لہٰذا ان اقوال کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اصول حدیث کے مطابق تفتیش ضروری ہے۔

۲- صحابۂ کرام کے اقوال اس وقت حجت ہوں گے جب آنحضور ﷺ سے آیت کی تفسیر مستند طریقے سے ثابت نہ ہو، اگر آپ کی بیان فرمودہ کوئی تفسیر صحیح احادیث میں منقول ہو تو صحابہ کرام کے اقوال کی حیثیت محض تائیدی ہوگی اور اگر کوئی قول آپ کی بیان فرمودہ تفسیر کے معارض ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔

۳- جہاں آنحضور ﷺ سے کوئی تفسیر مستند روایات میں منقول نہ ہو اور صحابۂ کرام کی بیان کردہ تفسیروں میں کوئی اختلاف نہ ہو وہاں انہی کے اقوال کو اختیار کیا جائے گا۔

۴- جہاں صحابۂ کرام کی بیان کردہ تفسیروں میں کوئی اختلاف ہو وہاں اولاً تو یہ دیکھا جائے گا کہ ان مختلف اقوال میں کوئی ہم آہنگی ممکن ہے یا نہیں؟ اگر ممکن ہو تو اسی پر عمل کیا جائے گا اور اگر ممکن نہ ہو تو ایک مجتہد دلائل کے لحاظ سے جس قول کو زیادہ مضبوط پائے اسے اختیار کر سکتا ہے۔ (۲۳)

ماخذ چہارم- لغت عرب

قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس میں عربی زبان کے اسالیب، محاورے، استعارات، تعبیرات اور کنایات استعمال کئے گئے ہیں، اس لئے لغت عرب سے واقفیت کے بغیر قرآن کے صحیح مفہوم تک رسائی ممکن نہیں، لہٰذا جس آیت کی تفسیر قرآن و سنت یا آثار صحابہ میں موجود نہ ہو وہاں اس آیت کی وہ تفسیر کی جائے گی جو اہل عرب کی عمومی زبان اور عام محاورات میں قیاد طور پر کہی جاتی ہو، ایسی آیات کی تفسیر کے مواقع پر اشعار عرب سے استدلال کر کے کوئی ایسا قلیل الاستعمال معنی بیان کرنا غلط ہے جو لغت کی کتابوں میں موجود تو ہو لیکن عام محاورات اور بول چال میں مراد نہ لیا جاتا ہو، اس کی مثال یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ

''اضرب بعصاک الحجر'' اپنی لاٹھی کو پتھر پر مارو۔ (البقرہ:۶۰)

یہ جملہ جب کسی صاحب زبان کے سامنے بولا جائے گا وہ بدیہۃً اس کا یہی مطلب سمجھے گا کہ لاٹھی کو پتھر پر مارنے کا حکم دیا جا رہا ہے، لہٰذا اس کی یہی تفسیر معتبر اور صحیح ہے، اب اگر کوئی لغت کے دور دراز حوالوں کے ذریعہ یہ دعویٰ کرے کہ اس جملہ کا مطلب ہے ''لاٹھی کے سہارے اس چٹان پر چلو'' یعنی ''اضرب'' کے معنی ''مارو'' کے بجائے ''چلو'' اور ''الحجر'' کے معنی ''پتھر'' کے بجائے ''چٹان'' بیان کرے تو اگرچہ لغت کی کتابوں کا کوئی ایک آدھ حوالہ مل جائے لیکن عام محاورات کی مخالفت کی وجہ سے اس کا یہ دعویٰ مردود قرار دیا جائے گا۔ (۲۳)

ماخذ پنجم: عقل سلیم (رائے محمود)

بعض مصنفین نے تفسیر بالرائی کا تذکرہ غیر معتبر ماخذ کے ضمن میں کیا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ عقل سلیم اور رائی محمود تفسیر کے معتبر ماخذ میں سے ہے، اس سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ لوگ افراط و تفریط کا شکار ہیں، بعض لوگوں نے تفسیر قرآن کے ضمن میں غور و فکر اور اظہار رائے کو شجر ممنوعہ کا درجہ دے رکھا ہے اور اس کے لئے وہ مشہور حدیث ''من تکلم فی القرآن برایہ فاصاب فقد اخطا'' سے استدلال کرتے ہیں، جبکہ بعض لوگوں نے ہر طرح کی رائے اور من مانی کو جائز اور درست قرار دے رکھا ہے، صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں نقطہائے نظر اعتدال کے دو کناروں پر ہیں، معتدل اور معتدل نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایسی رائے جو تفسیر کے متفقہ اصولوں اور اسلام کے اجماعی طور پر طے شدہ ضوابط سے ہٹ کر اختیار کی جائے وہ یقیناً غیر معتبر اور مردود ہے، البتہ ایسی رائے جو مسلمہ تفسیری اصولوں اور کتاب و سنت کے عمومی ذوق و مزاج کے خلاف نہ ہو معتبر اور مستند ہے اور اس کے

ذریعہ قرآن کے مخفی اسرار و نکات بیان کئے جا سکتے ہیں، کیونکہ خود قرآن کریم نے تدبر و استنباط کو متعدد مقامات پر مستحسن قرار دیا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ فکر و تدبر پر بالکلیہ روک لگا دینے کی صورت میں قرآن سے شرعی احکام کے استنباط و استخراج کا سرے سے دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔

یہی بات علامہ زرکشی نے اپنی کتاب البرہان میں بیان فرمائی ہے، وہ رقمطراز ہیں:

''ایسی رائے محض جس کے پشت پر کوئی دلیل نہ ہو اس کے ذریعہ تفسیر کرنا جائز نہیں، البتہ ایسی رائے جس کی بنیاد کسی مضبوط دلیل پر قائم ہو معتبر ہے، پیش آمدہ مسائل میں اس کے ذریعہ فیصلہ کرنا جائز ہے۔''

خلاصۂ بحث یہ کہ تفسیر بالرائی مطلقاً ناجائز نہیں ہے بلکہ تفسیر بالرائی المحمود جائز اور تفسیر بالرائی المذموم ناجائز ہے۔

فہم قرآن کے معاون علوم و وسائل

تفسیر کے بنیادی ماخذ کی وضاحت کے بعد ان علوم کا تذکرہ بھی کر دینا مناسب ہے جو فہم قرآن اور تبیین قرآن میں مساعد و معاون ہیں اور جن سے عدم واقفیت یا صرف نظر کی صورت میں قرآن کے اصل مطالب و معانی تک رسائی ذرا مشکل ہے، وہ مساعد علوم مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔علم اسباب النزول	۲۔علم ناسخ و منسوخ
۳۔علم غریب القرآن	۴۔علم نظام القرآن

۱-علم اسباب النزول

قرآن مجید کے معانی و مفاہیم تک رسائی کا ایک بڑا ذریعہ اسباب نزول کا علم ہے، اگر آیت کا واقعہ متعلقہ معلوم ہو اور ان اسباب تک رسائی ہو جو اس کے نزول کا باعث ہوئے تو اس سے یقیناً اس کا مطلب سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اس کی تاویل راجح اور صحیح ترین تفسیر کا علم حاصل ہوتا ہے، اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہم قرآن کے مطالب کو صحیح طور پر معلوم کرنا چاہتے ہیں تو اس بات کی ضرورت ہے کہ علم تفسیر کے علاوہ اسباب نزول معلوم کرنے کی طرف بھی توجہ دیں، اس لئے کہ مفسرین کے اقوال نہ تمام مشکلات کی گرہ کشائی کرتے ہیں اور نہ تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کرتے ہیں اور نہ ہر اجمال کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

امام واحدی فرماتے ہیں کہ

''جب تک کسی آیت کا واقعہ متعلقہ اور اس کا سبب نزول معلوم نہ ہو اس آیت کی تفسیر

معلوم نہیں ہو سکتی"۔ (۳۰)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ:

"سبب نزول کی پہچان کسی آیت کے فہم وادراک میں مدد دیتی ہے اس لئے کہ سبب کے علم سے مسبب کا معلوم ہونا ایک فطری بات ہے۔ (۳۱)

علامہ ابن دقیق العید کا قول ہے کہ

"سبب نزول کی معرفت قرآن کے مطالب ومعانی کے حصول کا زبردست ذریعہ ہے۔" (۳۲)

اسباب نزول سے ناآشنا ہونے کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوا کہ لوگ التباس وابہام کا شکار ہو گئے اور آیت کا مطلب غلط سمجھنے لگے، اس قسم کا واقعہ مروان بن حکم کو بھی پیش آیا تھا، اس نے سمجھا تھا کہ آیت قرآنی "لاتحسبن الذین یفرحون بما اتوا ویحبون أن یحمدوا بمالم یفعلوا" (آل عمران: ۱۸۸) مسلمانوں کے لئے وعید ہے، اس نے اپنے دربان سے کہا کہ اے رافع اجا کر ابن عباس سے کہو کہ: اگر ہر وہ آدمی جو اپنے اعمال سے خوش ہوتا ہے اور ناکردہ کاموں پر دوسروں سے خراج تحسین وصول کرنا چاہتا ہے عذاب میں گرفتار کیا جائے گا تو ہم میں سے کوئی بھی عذاب سے نہیں بچ سکتا۔

حضرت ابن عباسؓ نے جواباً فرمایا: تمہیں اس سے کیا سروکار؟ واقعہ یوں تھا کہ آنحضورﷺ نے یہود کو بلا کر ایک بات پوچھی، انہوں نے اس بات کو چھپا کر غلط جواب دیا، گویا انہوں نے ایک جھوٹی بات بتلا کر اس پر آنحضورﷺ سے داد چاہی اور اصل بات کو چھپانے پر خوشی کا اظہار کیا، پھر حضرت ابن عباسؓ نے یہ آیت تلاوت کی: "واذاخذ اللہ میثاق الذین اوتو الکتاب لتبیننہ للناس (آل عمران: ۱۸۷) (۳۳)

اگر سبب نزول بیان کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تو لوگ آج تک نشہ آور اشیاء اور شراب کو حلال طیب سمجھنے میں حق بجانب ہوتے اور اس آیت سے استدلال کرتے:

"لیس علی الذین آمنوا وعملوا الصلحت جناح فیماطعموا" (المائدہ: ۹۳)، حضرت عثمان بن مظعون اور عمرو بن معدیکرب کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اس آیت کے پیش نظر شراب کو مباح قرار دیا کرتے تھے کیونکہ وہ اس آیت کے سبب نزول سے واقف نہ تھے (۳۴)، اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں حضرت حسن بصری اور دیگر راویوں کا بیان ہے کہ جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کیا "ہمارے ان

بھائیوں کا کیا ہوگا جو شراب کی حرمت سے قبل وفات پاچکے ہیں حالانکہ ہمیں خدا نے بتایا ہے کہ شراب نجس ہے" تب مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

سبب نزول کی ضرورت نہ ہوتی تو لوگ آیت قرآنی "وللہ المشرق و المغرب" کے پیش نظر جس جانب چاہتے رخ کر کے نماز پڑھتے مگر سبب نزول سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ یہ آیت ان صحابہ کرام کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہوں نے ایک تاریک رات میں آنحضورﷺ کی معیت میں نماز پڑھی تھی، قبلہ معلوم نہ ہو سکا اس لئے ہر شخص نے اپنے اجتہاد پر عمل کر کے جدھر کا رخ کر کے نماز پڑھ لی، اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کا یہ عمل ضائع نہیں کیا اور ان کی نماز قبول کر لی، اس لئے کہ تاریک رات میں قبلہ کی پہچان دشوار تھی۔ (۳۵)

۲ علم ناسخ و منسوخ

قرآن مجید کے معانی ومطالب تک رسائی کا ایک ذریعہ علم ناسخ ومنسوخ بھی ہے، نسخ کی اصطلاحی تعریف میں علماء کے یہاں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن صحیح ترین تعریف جو لغت عرب اور شرعی نصوص دونوں کے مطابق ہے، حسب ذیل ہے۔

"کسی شرعی دلیل کی بنا پر کسی دینی حکم کے اٹھ جانے کو نسخ کہتے ہیں۔"

علامہ عبدالوہاب خلاف نے اپنی کتاب "علم اصول الفقہ" میں بڑی تفصیل کے ساتھ نسخ سے متعلق گفتگو فرمائی ہے، انہوں نے نسخ کی تعریف، اس کی حکمت، اس کی اقسام، قابل نسخ اور غیر قابل نسخ اور نسخ کی انواع پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے، مناسب یہ ہے کہ اس کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔

نسخ کی تعریف: اصولیین کی اصطلاح میں نسخ نام ہے کسی حکم شرعی پر عمل کے ابطال کا، کسی ایسی دلیل متاخر کے ذریعہ جو ابطال پر صراحۃً دلالت کرے یا ضمناً، ابطال کلی طور پر ہو یا جزئی طور پر، ایسی مصلحت کی وجہ سے جو اس کی متقاضی ہوتی ہو۔

نسخ کی حکمت یہ ہے کہ اس قانون خداوندی کا مقصد اصلی لوگوں کے مصالح کی تحقیق ہے اور مصلحتیں تغیر احوال کی وجہ سے بدلتی رہتی ہیں، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی حکم تحقیق مصالح کی خاطر کچھ اسباب کے تقاضے کے تحت مشروع کیا جاتا ہے بعد میں وہ اسباب زائل ہو جاتے ہیں اور اس حکم کے بقا میں کوئی مصلحت باقی نہیں رہتی، لہٰذا اسے منسوخ کر دیا جاتا ہے۔

نسخ کی مختلف قسمیں ہیں:

۱۔ نسخ صریح ۲۔ نسخ ضمنی ۳۔ نسخ کلی ۴۔ نسخ جزئی

ہر ایک کی تفصیل اور مثال پیش کرنا طوالت سے خالی نہیں اس لئے صرف نسخ کلی کی ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

متوفی عنہا زوجہا (وہ عورت جس کے شوہر کا انتقال ہو جائے) اس کی عدت ابتدا میں سال بھر تھی، بعد میں چار مہینے دس دن کے ذریعہ اسے منسوخ کر دیا گیا، گویا آیت قرآنی: "والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج" (سورہ بقرہ: ۲۴۰) اس آیت قرآنی: "والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر و عشرا" (سورہ بقرہ: ۲۳۴) کے ذریعہ منسوخ ہے۔

قابل نسخ اور غیر قابل نسخ آیت کے متعلق ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:

تین قسم کی نصوص، ناقابل نسخ ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:

۱- وہ نصوص جو اساسی احکام کو متضمن ہیں، جو ہر زمانے اور ہر حال میں یکساں رہتے ہیں، لوگوں کے احوال کے بدلنے سے نہیں بدلتے اور جو حسن و قبح کے سلسلے میں استقراری حیثیت کے حامل ہیں، مثلاً وہ نصوص جو ایمان باللہ، ایمان بالرسالہ، ایمان بالکتب، ایمان بالآخرۃ اور اصول عقائد و عبادات نیز امہات فضائل جیسے مضامین پر مشتمل ہیں، اسی طرح وہ نصوص جو شرک باللہ، ناحق کسی کو قتل کرنا، والدین کی نافرمانی وغیرہ سے متعلق مواد پر مشتمل ہیں۔

۲- وہ نصوص جو احکام پر مشتمل ہیں البتہ اپنے صیغہ و اسلوب کے ذریعہ ہمیشگی پر دلالت کرتی ہیں مثلاً حد قذف کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

"ولا تقبلوا لھم شھادۃ ابدا" (سورۃ النور: ۴)

۳- وہ نصوص جو گذرے ہوئے واقعات و حادثات پر دلالت کرتی ہیں۔

ان کے علاوہ باقی اور تمام نصوص قابل نسخ ہیں۔

یہ بات بھی عرض کر دینا خالی از فائدہ نہیں ہے کہ ناسخ وہی چیز بن سکتی ہے جو منسوخ سے زیادہ قوی یا کم از کم قوت کے لحاظ سے اس کے مساوی ہو۔

لہٰذا نصوص قرآنیہ ایک دوسرے کے لئے ناسخ بن سکتی ہیں اسی طرح سنت متواترہ کے ذریعہ بھی نسخ ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ تمام نصوص قطعی ہیں اور قوت کے لحاظ سے مساوی ہیں۔

البتہ نص قرآنی سنت غیر متواترہ یا قیاس کے ذریعہ منسوخ نہیں ہو سکتی اس لئے کہ اقوی ادنیٰ کے ذریعہ منسوخ نہیں ہو سکتا۔(۳۷)

۴- علم غریب القرآن

قرآن مجید کے حقیقی مفاہیم تک پہنچنے کا ایک ذریعہ علم غریب القرآن بھی ہے۔

علم غریب القرآن سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ رومی رقمطراز ہیں:

"العلم المختص بتفسیر الالفاظ الغامضۃ فی القرآن الکریم و توضیح معانیھا بماجاء فی لغۃ العرب و کلامھم"

اس علم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"ایسا علم جو قرآن کے پیچیدہ الفاظ کی تفسیر اور ان کے معانی کی توضیح کے ساتھ لغت عرب اور کلام عرب کے مطابق مخصوص ہو، وہ علم غریب القرآن ہے۔ ایک مفسر کے لئے اس علم سے واقفیت ضروری ہے اس کے بغیر تفسیر قرآن جائز نہیں، حضرت امام مالک، حضرت مجاہد اور حضرت ابن عباس کے اقوال سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

قرآن کے مشکل اور پیچیدہ الفاظ کے معانی کی وضاحت قرآن و سنت کے ذریعہ نہ ہو سکے تو اس کے لئے جاہلی شاعری کی طرف رجوع کیا جائے، چنانچہ مفسرین صحابہؓ بالخصوص حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ تفسیر قرآن میں بکثرت اس کی طرف رجوع کرتے تھے اور الفاظ غریبہ کی تحقیق میں اشعار سے استشہاد کرتے تھے، مولانا حمید الدین فراہیؒ اور ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اپنی تفاسیر میں متعدد مقامات پر غریب القرآن کی لغوی تشریح کے لئے بطور تائید کلام عرب کو پیش کیا ہے۔

چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

۱- قرآن کریم کی سورہ معارج کی آیت ہے: "عن الیمین و عن الشمال عزین" (الآیۃ: ۳۷) اس آیت میں لفظ "عزین" کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

اس کے معنی "حلقۃ الرفاق" (ساتھیوں کے حلقے) ہیں اور استشہاد میں انہوں نے عبید بن الابرص کا یہ شعر پڑھا:

فجاؤوا یھرعون الیه حتی   یکونوا حول منبرہ عزینا

(وہ اس کی طرف دوڑتے ہوئے آئے تا کہ اس کے منبر کے گرد حلقہ باندھ لیں)

۲- سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۳ "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا"

میں لفظ "حبل" کی تشریح مولانا اصلاحی نے یوں کی ہے:

''حبل کے معنی رسی کے ہیں، اپنے اس معنی سے ترقی کر کے یہ لفظ تعلق اور ربط کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اس لئے کہ رسی دو چیزوں میں ربط و تعلق کا ذریعہ ہوتی ہے، ایک حماسی شاعر کا مشہور شعر ہے:

ولکنی وصلت الحبل منه   مواصلة بحبل ابی بیان

(لیکن میں نے اس سے اپنا تعلق جوڑے رکھا، ابو بیان کے تعلق سے وابستگی کی بنا پر)

پھر مزید ترقی کر کے یہ لفظ معاہدہ کے مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگا" "الا بحبل من الله وحبل من الناس" آیت زیر بحث میں "حبل" سے مراد قرآن ہے اس لئے کہ یہی ہمارے رب اور ہمارے درمیان ایک عہد و میثاق ہے۔(۳۹)

علامہ سیوطی نے الاتقان میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق ایک تفصیلی واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ خانہ کعبہ کے صحن میں بیٹھے ہوئے قرآن مجید کی تفسیر بیان کر رہے تھے، لوگ ان کے ارد گرد حلقہ بنائے ہوئے بیٹھے تھے، نافع بن ازرق نے نجدہ بن عویمر سے کہا: چلو اس نوجوان سے ملاقات کرتے ہیں جو قرآن مجید کی تفسیر اس کے علم کے بغیر بیان کرنے کی جرأت کر رہا ہے، دونوں ان کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم لوگ آپ سے قرآن مجید کی چند آیات کے بارے میں دریافت کرنا چاہتے ہیں، ہماری خواہش ہے کہ آپ ان کی تفسیر بیان فرما دیں اور عربوں کے کلام سے اس کی تائید بھی پیش کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو واضح اور صاف عربی زبان میں نازل فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: جو جی چاہے آپ مجھ سے دریافت کرلیں، نافع نے کہا: مجھے اللہ تعالیٰ کے قول "عن الیمین وعن الشمال عزین" کا معنی بتائیں، انہوں نے جواب دیا کہ "عزین" دوست احباب کے گروہ کو کہتے ہیں اور پھر استشہاد میں عبید بن الابرص کا یہ شعر پیش فرمایا:

فجاؤوا یھرعون الیه حتی   یکونوا حول منبر عزینا

نافع نے حضرت ابن عباسؓ سے ایک سو نوے سوالات کئے، انہوں نے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیا اور استشہاد میں اشعار پیش کئے، علامہ سیوطی نے تمام سوالات و جوابات کو الاتقان شامل کیا ہے۔

۴۔علم نظام القرآن

قرآن مجید کے معانی و مطالب تک پہنچنے کا ایک ذریعہ نظام القرآن کا علم بھی ہے۔نظام

قرآن کی اہمیت اور اس کے مفہوم پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا عمر اسلم اصلاحی رقمطراز ہیں:

''نظم کلام صحیح تاویل تک پہنچانے میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے، نظم کا مطلب یہ ہے کہ ہر سورہ کا ایک خاص عمود ہوتا ہے اور اس سورہ کی تمام آیات نہایت حکیمانہ مناسبت کے ساتھ اس عمود سے تعلق رکھتی ہیں، جب سورہ کا عمود یا مرکزی موضوع سامنے ہوتا ہے تو آیات کی تاویل میں غلطی کا امکان کم ہوتا ہے، اس طرح ایک سورہ متفرق احکام و ہدایات پر مشتمل آیات کا مجموعہ ہونے کے بجائے ایک نہایت حسین وحدت نظر آتی ہے، پھر کئی سورتیں مل کر ایک گروپ بنتا ہے اور جس طرح ہر سورہ کا ایک عمود ہوتا ہے اسی طرح ہر گروپ کا ایک عمود ہوتا ہے، اس گروپ کی تمام سورتوں کا اس عمود سے ایک خاص تعلق ہوتا ہے، یہی نہیں بلکہ ہر گروپ کی تمام سورتوں میں ایک تدریجی اور منطقی ربط ہوتا ہے اور تمام گروپوں کے مضامین میں بھی منطقی اور تدریجی ربط ہے، ان تمام گروپ کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔"

مولانا نے اپنے اس مقالے میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر کلام کیا ہے، بحث کے اختتام پر وہ فرماتے ہیں:

''یہ حقیقت ہے کہ قرآن انسان کے باطن کی صدا، اس کی روح کا نغمہ اور اس کی فطرت کا ترانہ ہے، لیکن یہ ساری خصوصیات اسی صورت میں نظر آئیں گی جب اس کے اندر ایک خاص قسم کا نظم ہو اور وہ ربط بھی منطقی اور تدریجی ہو، اب اگر قرآن مجید کو نظم سے خالی محض چند منتشر احکام کا مجموعہ قرار دیا جائے تو اس کا صدائے باطن، نغمۂ روح اور ترانۂ فطرت ہونا تو کجا اس کے کلام بلاغت نظام ہونے کا دعویٰ بھی ایک مضحکہ خیز دعویٰ قرار پائے گا۔''(۴۴)

مطلوبہ منہاج-تجاویز اور مشورے

نماحدہ دینی مدارس کے تدریس قرآن کے مناہج کی سابقہ تفصیل سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ اولاً تو ان کے نصابہائے تعلیم میں قرآن مجید کو وہ مقام نہیں دیا گیا ہے جو اس کے شایان شان ہے اور تدریس قرآن کے لئے جتنا وقت مختص کیا جانا چاہئے تھا اتنا نہیں کیا گیا ہے اور ثانیاً یہ کہ جو مواد و مضامین اور طریقہائے تدریس اختیار کئے گئے ہیں وہ فہم قرآن کی مطلوب صلاحیت پیدا کرنے سے قاصر ہیں، دراصل قرآن مجید ایک زندہ جاوید، تا قیام قیامت باقی رہنے والی، ہر زمانے کے تقاضے اور ضروریات کی کفالت کرنے والی، معاصر چیلنجز اور شکوک و شبہات کا ازالہ کرنے والی اور روز مرہ کی زندگی میں پیش آمدہ مسائل و مشکلات میں رہنمائی کرنے والی کتاب ہے اس لئے اس کی تدریس کے لئے ایسا منہاج اختیار کیا جانا چاہئے جس سے مذکورہ

تمام مقاصد بیک وقت حاصل ہو سکیں اور ساتھ ہی اس کے ذریعہ طلبہ کے اندر فہم قرآن اور تدبر قرآن کی ایسی لیاقت وصلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ تمام شعبہائے زندگی میں پیش آمدہ مسائل ومشکلات کا حل قرآن کے ذریعہ تلاش کر سکیں اور قرآن سے ایسا شغف اور شعوری تعلق پیدا ہو جائے کہ زندگی کے ہر ہر قدم پر اسی کے نور سے مستنیر ہونا ان کی فطرت ثانیہ بن جائے۔

پچھلے صفحات میں تفسیر قرآن کے بنیادی ماخذ اور معاون ومددگار علوم بالتفصیل بیان کئے گئے ہیں، ان کی روشنی میں تدریس قرآن کے سابقہ تینوں پہلوؤں کا مطلوبہ منہاج پیش خدمت ہے:

۱- ابتدائی اور ثانوی درجات کے علاوہ عربی کے ابتدائی درجات میں ہفتہ میں کم از کم تین گھنٹیاں تجوید وترتیل کے لئے لازماً مختص کی جائیں تاکہ وعظ وتذکیر کے مواقع پر اور بطور خاص نماز میں تجوید وترتیل کی رعایت کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کی جاسکے۔

۲- ثانوی اور عربی درجات میں کم از کم عالمیت تک (اگر فضیلت تک ہو جائے تو بہتر ہے) قرآن مجید کے مختلف مقامات کی تحفیظ کا لازماً اہتمام کیا جائے تاکہ بروقت اور برائے استدلال واستنباط قرآنی آیات بآسانی پیش کی جاسکیں۔

۳- تبیین قرآن کے لئے جو تدریس قرآن کا سب سے اہم مرحلہ ہے ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو قرون اولیٰ سے لے کر اب تک مسلمہ اصولوں کے مطابق ہو اور ساتھ ہی معاصر چیلنجز اور مغربیت کے زیر اثر ذہنوں میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا ازالہ کر سکے اور وہ منہاج مندرجہ ذیل ہے:

الف: عربی سوم سے کم از کم عالمیت تک اصول تفسیر اور علوم القرآن کی سہل اور ابتدائی کتابیں لازماً پڑھائی جائیں اور فضیلت کے درجات میں علوم القرآن کی مفصل کتابیں داخل نصاب کی جائیں، اس لئے کہ یہ ایک فطری اور منطقی بات ہے کہ اصول تفسیر اور علوم القرآن میں مطلوبہ مہارت حاصل کئے بغیر تبیین قرآن کا مقصد کما حقہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

ب: تبیین قرآن اور قرآن کے معانی ومطالب کے لئے اولاً وبالذات تفسیر کے بنیادی ماخذ سے استفادہ کیا جائے، ثانیاً سابق میں بیان کردہ معاون ومساعد علوم کو پیش نظر رکھا جائے، یعنی قرآن کی تفسیر اولاً قرآن کے ذریعہ کی جائے اور اس کی شکل نہ ہو تو صحیح تفسیری روایات سے مدد لی جائے، موجودہ تحقیقاتی دنیا میں صحیح اور غیر صحیح کے مابین امتیاز کوئی مشکل کام نہیں، بطور خاص علامہ ناصر الدین البانی کی تحقیقی کاوش کے تناظر میں جنہوں نے غایت جدوجہد کے ذریعہ احادیث صحیحہ اور احادیث ضعیفہ کو علاحدہ علاحدہ جلدوں میں بڑی ہی جامعیت کے ساتھ اکٹھا کر دیا ہے، اگر صحیح تفسیری

روایات الفاظ قرآنی سے بظاہر معارض ہوں (جس کی مثال شاذ ونادر ہی مل سکتی ہے) تو قرآن کے بجائے روایات میں تاویل کی جائے تاکہ دونوں میں مطابقت وموافقت پیدا ہو جائے، مطابقت کے ممکن نہ ہونے کی صورت میں روایات کے سلسلے میں توقف اختیار کیا جائے۔

ج: نظم قرآن بلاشبہ قرآن فہمی کا ایک بڑا اہم ذریعہ ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اسے تبیین قرآن کے لئے صرف ایک ذریعہ اور وسیلہ سمجھنا چاہئے، اسے تبیین قرآن کی ایسی بنیاد نہ بنائی جائے کہ اس کی رعایت میں مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی لازم آئے۔

۴- تبیین قرآن کا مقصد پورے طور پر حاصل کرنے اور مستشرقین کی جانب سے وارد کئے جانے والے شکوک وشبہات کے ازالہ کے لئے تاریخ ارض قرآن کی بڑی اہمیت ہے، لہٰذا تاریخ ارض قرآن سے متعلق کتابیں نصاب میں شامل کی جائیں اور ان کی روشنی میں تدریس قرآن کا فریضہ انجام دیا جائے۔

۵- معیار تفسیر بتدریج بلند کیا جائے اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ:

الف: عربی سوم وچہارم میں صرف ترجمہ اور ترکیب پر اکتفا کیا جائے۔

ب: عربی پنجم میں تفسیر کے بنیادی ماخذ کو پیش نظر رکھتے ہوئے سیاق وسباق پر توجہ مرکوز کی جائے، ترکیب کا سلسلہ موقوف کر دیا جائے الا یہ کہ کوئی مشکل مقام آجائے۔

ج: عربی ششم میں تفسیر کے مسلمہ اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے نظم کلام پر زور دیا جائے۔

د: عربی ہفتم میں مفسرین کے اقوال اور ان کے مابین مقارنہ وترجیح کی صلاحیت پیدا کی جائے۔

ہ: عربی ہشتم میں سورہ کا مرکزی مضمون اخذ کرنے اور نظم کی تعیین کرنے کی طلبہ سے مشق کرائی جائے، نیز قرآنی آیات اور روایات صحیحہ کے مابین تعارض کی صورت میں تطبیق پیدا کرنے کی لیاقت ان کے اندر پیدا کی جائے۔

۶- قرآن ایک زندہ جاوید، مکمل ضابطۂ حیات اور کتاب ہدایت ہے، تدریس کے وقت اس پہلو پر خاص توجہ دی جائے، اس کے ترتیبی، دعوتی اور عملی پہلو کو بطور خاص اجاگر کیا جائے تاکہ طلبہ کا تعلق قرآن پاک سے زندہ اور عملی ہو صرف نظریاتی تعلق ہی نہ رہ جائے اور قرآن قال کے ساتھ ساتھ حال بھی بن جائے، بقول علامہ اقبال۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

قرآنی اسالیب دعوت (۲)

مقبول احمد فلاحی

(۱۵) دعوت بذریعہ در حدیث دیگراں

اپنی بات پہنچانے کا ایک نفسیاتی اسلوب یہ ہے کہ کبھی مخاطب کا اعراض حد سے آگے بڑھنے لگے تو داعی بھی بظاہر اعراض کی پالیسی اپنا لے یعنی یہ کہ جو باتیں کہنی مقصود ہوں انہیں براہ راست کہنے کے بجائے اپنوں کے درمیان اس انداز سے کی جائیں کہ اس کلام کے بظاہر مخاطب تو اپنے ہوں مگر اصل مدعا مخاطب کو سنانا ہو، اس کی زندگی اس کے عادات و اطوار، اس کے افکار و کردار زد میں آتے ہوں، اعراض بسا اوقات مدعو کو داعی کی طرف مائل کرتا ہے اور در حدیث دیگراں جب بات اس کے کان میں پڑتی ہے کہ تو ان سے متاثر بھی ہوتا ہے، پھر اس کے اندر کچھ بھی جذبۂ خیر ہوتا ہے تو دیر یا سویر دعوت سننے اور ماننے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

نفسیات کے ماہرین نے اس باب میں بڑے کامیاب تجربے کئے ہیں اور ذہنی تسخیر کے نفسیاتی حربے کو خوب خوب استعمال کیا ہے، آج بھی عوامی زندگی میں اس کے تجربات ہوتے رہتے ہیں، اب یہ داعی کی حکمت، تدبر اور سوجھ بوجھ پر منحصر ہے کہ اس نسخہ کو کب، کہاں اور کیسے استعمال کر پاتا ہے۔ قرآن پاک کا یہ معروف اسلوب دعوت ہے کہ لوگ تو سوال کرتے ہیں داعی کو زچ اور لاجواب کرنے کے لئے مگر قرآن جواب میں در حدیث دیگراں کے پیرائے میں مناسب جگہوں پر ایسی بات کہتا ہے کہ سائل اس کی چوٹ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح کہیں بات بظاہر مسلمانوں سے کہی جاتی ہے مگر نشانے پر منکرین کا فکر و عمل ہوتا ہے۔ یسئلونک عن الشهر الحرام قتال فيه، قل قتال فيه كبير، وصد عن سبيل الله و كفر به والمسجد الحرام و اخراج اهله منه اكبر عند الله والفتنة اكبر من القتل، ولا يزالون يقاتلونكم حتى يردوكم عن دينكم ان استطاعوا، ومن يرتدد منكم عن دينه فيمت وهو كافر فاولئك حبطت اعمالهم في الدنيا و الآخرة واولئك اصحاب النار

هم فيها خالدون (سورۃ البقرۃ: ۲۱۷) یا مثلاً سورۂ بقرہ آیات ۱۰۴، ۲۲۱، آل عمران ۱۰۵ وغیرہ۔

سورۂ یوسف، سورۂ کہف اور متعدد دوسری سورتوں میں بظاہر مخالفین بطور استہزاء بعض تاریخی شخصیات اور ان کے حالات زندگی کے بارے میں سوال کرتے ہیں، قرآن ان کے اس طرز عمل کا خوبصورت انداز سے یوں نوٹس لیتا ہے کہ پورا واقعہ یا اس کے ضروری اجزاء بیان کئے جاتے ہیں اور اس میں نبی کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی ہوتی ہے، مخالفین کے زوال و تباہی کی داستان ہوتی ہے اور وہ سب کچھ ہوتا ہے جو کسی درجہ میں سلیم الطبع انسان کو معاندانہ روش ترک کر دینے پر آمادہ کرنے والی ہوتی ہے، لیکن ان واقعات سے اہل دانش و بینش ہی عبرت حاصل کرتے ہیں۔ لقد كان في قصصهم عبرة لاولي الالباب۔ (سورہ یوسف: ۱۱۱)

(۱۶) مسلمات سے مقتضیات پر استدلال

بعض بنیادی حقائق ایسے ہیں جنہیں تقریباً پوری دنیائے انسانیت تسلیم کرتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کائنات کا ایک خالق، مالک، مدبر، فرمانروا اور مقتدر اعلیٰ ہے، اور وہ تمام ممکنہ کمالات کی حامل ہستی ہے۔ چیزوں کو عدم سے وجود میں لانا، مارنا، جلانا، عزت، دولت، نفع نقصان ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ پوری دنیا اس کی محتاج ہے اور وہ اپنے ارادوں کی تکمیل میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وغیرہ، یا یہ کہ وہی دنیا میں انسانوں کو زندگی گزارنے کا راستہ بتاتا ہے۔ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کا انتظام کرتا ہے۔ انسانوں کو راستہ بتانے کے لئے اپنی کتاب اور اپنے رسول بھیجتا ہے۔ یا یہ کہ خدا کے دربار میں انصاف ہے، وہ انصاف کرنے والا ہے اور ایک دن ہر طرح کے ظلم و تعدی کا حساب لینے والا ہے۔ بھلائی برائی کی جزا اور سزا دینے والا ہے۔

اس طرح کے احساسات و خیالات عام طور پر پائے جاتے ہیں، مگر لوگوں کی عملی زندگیوں کا مشاہدہ کیجئے تو قدم قدم پر اپنے ہی بنیادی اصولوں اور خیالات سے انحراف کرتے نظر آتے ہیں۔ خدائے واحد کی قدرت کاملہ کو تسلیم کرتے ہوئے موت زندگی عزت ذلت رزق پانی ہر ہر نعمت کے لئے الگ الگ بت تراشتے اور ان کی پرستش کرتے ہیں۔ اس مالک کے لئے اشارہ سے ہر شے کو عدم سے وجود میں لانے کی قدرت تسلیم کرتے ہوئے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے حضرت مریمؑ کے بطن سے بے باپ کے لڑکا کیسے پیدا ہو گیا۔ آخرت کو مانتے ہوئے کفارہ اور آواگون کے موہوم عقائد بھی تسلیم کرتے ہیں۔ سلسلۂ رسالت کو تسلیم کرتے ہوئے عملی زندگی میں دین و دنیا کی

تفریق کرتے اور دنیوی امور میں خود فیصلہ کن قوت بن جاتے ہیں۔ کائنات کی تخلیق بے شک اس نے کی ہے لیکن تخلیق کے بعد آرام کر رہا ہے۔ نظام کائنات چلانے کے لئے کچھ دوسری ہستیوں کو ذمہ داری دے دی ہے اور اب وہی اصل کارفرما قوت کے طور پر امور کائنات میں براہ راست دخیل ہیں، یہ اور اس طرح کے بہت سے عملی تضادات میں انسان گرفتار ہے۔

طریقہ دعوت یہ ہے کہ جو حقائق مسلم ہیں ان پر مخاطب کے ذہن و دماغ کو مرتکز کیا جائے پھر ان سے جو منطقی نتائج ہونے چاہئیں ان کی جانب توجہ دلائی جائے۔ اصل اور فرع کے درمیان تضادات کو دور کرکے حقائق سے روشناس کرانے کی کوشش کی جائے۔ وقالوا اتخذ الله ولدا سبحنه بل له ما في السموت والارض ، كل له قانتون. بديع السموت والارض ، واذا قضى امرا فانما يقول له كن فيكون (البقرة آيت ۱۱۶، ۱۱۷)، ،ان کا قول ہے کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے۔ اصل حقیقت یہ ہے زمین و آسمان کی تمام موجودات اس کی ملک ہیں، سب کے سب اس کے مطیع فرمان ہیں، وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے اس کے لئے بس یہ حکم دیتا ہے کہ ہوجا اور وہ ہو جاتی ہی ہے،،، البقرہ آیۃ الکرسی ۲۵۵۔ ترجمہ۔ اللہ زندہ و جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے، کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے، اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت و ادراک میں نہیں آسکتی الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔،، مباحثہ ابراہیم و نمرود آیۃ ۲۸۳۔ وغیرہ یہ اس طرح کی بہت سی آیات قرآن حکیم میں موجود ہیں جن کے ذریعہ ذہنوں میں سوالات پیدا کرکے درست جوابات دئے گئے ہیں۔

(۱۷) مدعو گروہ کی کتابوں اور تعلیمات سے استدلال۔

ایک حد تک انسانی سرشت میں معروف و منکر کی تمیز موجود ہے بلکہ معروف کہتے ہی ان چیزوں کو ہیں جو طبع سلیم کے لئے مانوس ہوں اور منکرات وہ ہیں جو طبیعت پر گراں ہوں۔ انسانی فطرت ان کو برا جانتی ہو۔ اسی طرح انسانوں کی اکثریت کسی مذہب، کتاب، شخصیت یا آدرش سے

وابستہ ہے اور نہایت فخر سے اپنی ان وابستگیوں کا اظہار بھی کرتی ہے مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض مفادات کے تحت نہایت بے دردی سے اپنی ہی کتابوں، مذاہب، شخصیات یا آدرشوں کی خلاف ورزی بھی کرتی رہتی ہے۔

قرآن نے اس اسلوب سے بہت کام لیا ہے یعنی یہ کہ مسلمہ حقائق جو ہر جگہ موجود ہیں ان سے انحرافات کی صورت میں گرفت کی ہے اور ان ہی کے معتقدات و خیالات کو گواہ بنایا ہے مثلاً یہودی تورات میں تحریفات کے باوجود اس میں موجود بعض بنیادی حقائق کا فخریہ ذکر کرتے تھے مگر عملی زندگی میں ان سے انحراف کرتے تھے۔ ان سے کہا گیا۔ یہ کیا طریقہ ہے کہ اپنی ہی کتاب کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہو۔ اور اس اسلوب سے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ اصل مسئلہ کتاب اور نبی کے اختلاف کا نہیں ہے بلکہ معاملہ مفاد پرستی اور ہوا و ہوس کی غلامی کا ہے۔

اناجیل میں وحدانیت کی واضح تعلیم موجود ہے مگر ساتھ ہی تثلیث کا عقیدہ بھی رائج ہے۔ چنانچہ مذاہب اور کتب سماوی کی بنیادی تعلیمات کے حوالے سے توحید، رسالت، آخرت اور دیگر ایمانیات کی دعوت دی گئی ہے۔ اسی طرح ویدوں میں توحید و رسالت کا واضح تصور موجود ہے مگر عملی دنیا میں لاکھوں بت بنا کر ان کی پرستش کی جاتی ہے۔

دعوت کا کام کرنے والے کو مدعو قوم کی کتابوں، مزعومات، اعتقادات اور ان میں مثبت تعلیمات کا علم ہونا چاہئے تاکہ ان کے حوالے سے صحیح سمت میں مدلل انداز سے دعوت دی جا سکے۔ "الذين آتينهم الكتاب يتلونه حق تلاوته، اولئك يومنون به ، ومن يكفر به فاولئك هم الخاسرون،، جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے وہ اس (قرآن) پر بھی سچے دل سے ایمان لے آتے ہیں اور جو اس کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کریں وہی اصل میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔،، (البقرۃ آیت ۱۲۱) مزید ملاحظہ ہو آل عمران آیات ۲۳، ۲۲، ۳۴، ۵۱۔

(۱۸) اصولوں کے تحت روا داری اور وسعت نظری۔

تحزب، قوم پرستی، مذہبی کٹرپن وغیرہ جذبات کے کچھ فائدے بھی ہیں اور کچھ نقصانات بھی۔ لیکن اگر گروہی عصبیتیں حقائق کے لئے پردہ بن جائیں تو سخت نقصان دہ ہیں اور ذات حق کی نگاہ میں حد درجہ ناپسندیدہ ہیں۔ داعی کو ان عصبیتوں اور آلائشوں سے خود کو اوپر اٹھا لینا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ مخاطب بھی حقیقت پسند بنیں۔ دلوں پر قفل لگا کر نہ رہیں۔ روایات پسندی اور

آباء پرستی جیسے اندھیروں سے باہر آئیں۔ ان محدود رجحانوں سے انہیں باہر لانے کے لئے اولاً داعی کو وسعت قلب و نظر کے ساتھ اصول و حقائق کا علم بردار بننا چاہئے۔ اس کی دعوت اور قول و کردار میں اس وسعت فکر و نظر کی علامات پائی جانی چاہئے۔ اس مقام پر داعی کا وقار بڑھتا ہے۔ اس کی حقیقت پسندی کے سبب دوسروں کی نظر میں اس کا تعارف ایک خیر خواہ اور حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ پھر اس کے لئے حق و صداقت کا پیغام پیش کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے بار بار اس بات کا اعلان کیا ہے کہ مسلمانوں یہ بات کہو کہ ہم تمام رسولوں اور تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سب ایک ہی منبع سے نکلے ہوئے ہیں مگر مفاد پرستوں نے ان چشموں کو گدلا کر دیا ہے۔ آؤ چشمہ صافی سے تمہیں سیراب کرتے ہیں تعصب، تنگ نظری، اور آباء پرستی کے اندھیروں سے نکل کر حق پرستی کی واضح شاہراہ پر آ جاؤ اور اپنا رشتہ اپنے رب سے، اس کی کتاب سے اور اس کے محبوب رسولؐ سے قائم کر لو۔

یہ اسلوب جگہ جگہ نظر آئے گا مثلاً امن الرسول بما انزل الیه من ربه والمومنون، کل آمن بالله وملائکته وکتبه ورسله، لا نفرق بین احد من رسله قالوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر۔ ترجمہ: رسولؐ اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے۔ اور جو لوگ اس رسول کو ماننے والے ہیں انہوں نے بھی اس ہدایت کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں، اور ان کا قول یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے، ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی، مالک ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔،، (البقرۃ ۲۸۵)

(۱۹) توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوا ہے۔

خطا و نسیان، گناہ و عصیان انسان کی طبعی ساخت کا ایک حصہ ہے۔ ہر انسان سے کبھی نہ کبھی چھوٹی بڑی غلطیوں کا صدور ہو جاتا بلکہ ہوتا رہتا ہے۔ غلطی ہو جانا تعجب کی بات نہیں ہے۔ اللہ کی نظر میں اصل جرم غلطیوں پر اصرار اور ڈھٹائی ہے۔ ابلیس نے حکم خداوندی کا انکار کرتے ہوئے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر کے ایک بڑا جرم کیا۔ حضرت آدم نے ممنوعہ درخت کا پھل کھا کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ ابلیس اپنی غلطی پر اصرار کر کے ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو گیا مگر آدم نے توبہ کر کے اپنا تعلق اپنے رب سے استوار کر لیا اور زمین کا خلیفہ بنا کر دنیا میں اتارے گئے۔ آدمیت اور

ابلیسیت کے درمیان بنیادی فرق غلطیوں پر اصرار یا توبہ و استغفار کا ہے۔ آدمیت کا کمال یہ ہے کہ جب غلطی کا احساس ہو جائے تو فوراً توبہ و استغفار کے ذریعہ صحیح راستہ کی طرف پلٹ جائے۔

انسان اور انسانی معاشرہ بھی مختلف النوع چھوٹی بڑی کوتاہیوں، کمزوریوں، گناہوں اور خطاؤں کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی ساخت کے اندر ایک قوت ودیعت فرمائی ہے جسے ضمیر یا نفس لوامہ کہتے ہیں، اس ضمیر کی ملامت سے وہ کبھی ہوشیار ہو جاتا ہے اور غلطیوں سے تائب ہو کر راہ راست پر آ جاتا ہے اور کبھی غفلت کا شکار ہو کر مسلسل غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ غلطیاں، بدعنوانیاں، زیادتیاں، اور ناانصافیاں اس کی طبیعت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ لیکن اللہ رحمٰن و رحیم کی کرم فرمائی سے چلتے چلتے ایسے جھٹکے بھی لگ جاتے ہیں کہ آدمی گناہوں سے بیزار ہو کر صراط مستقیم اختیار کر لیتا ہے، اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی اصلاح سے ناامید اور توبہ کا دروازہ بند سمجھ کر گناہوں کے سمندر میں ڈبکیاں لگانے لگتا ہے۔ انسانی معاشرے میں یہ سارے مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔

داعی کا کام یہ ہے کہ انسانی سرشت پر موقع و محل کی رعایت سے ایسی ضربیں لگائے کہ اپنی غلط روی کا احساس جاگ جائے اور پھر اسے امید دلائی جائے کہ گناہوں کی دنیا سے نکلنے کے بعد وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ اللہ غفور رحیم کا در رحمت ہمیشہ کھلا ہوا ہے۔ بہت کچھ گناہوں کے باوجود اللہ رب العالمین کا دامن عفو اسے اپنی پناہ میں لینے کے لئے بے تاب ہے۔ انسان کو چاہئے اپنے رب کی طرف پلٹے، توبہ و استغفار کرے۔ امید ہے اس طریقہ کار سے ایک عاصی انسان کے پلٹنے اور توبہ کے دروازے سے بارگاہ رب العزت میں باریابی کا شرف حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ "الا من تاب و آمن و عمل عملاً صالحاً فاولئک یبدل الله سیئاتهم حسنٰت، و کان الله غفوراً رحیماو من تاب و عمل صالحاً فانه یتوب الی الله متاباً" ترجمہ: الا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے میں لگ گیا ہو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور و رحیم ہے جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے۔ (الفرقان ۷۰) قرآن کتاب دعوت ہے اور انسانوں کو توبہ کے دروازے سے ایمان میں داخل ہونے کے لئے اس حقیقت کو بار بار دہرایا گیا ہے۔

(۲۰) مشاہدۂ کائنات سے حق کی روشنی ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات بنائی اور خوب بنائی۔ ایک ذرہ سے لے کر نظام کہکشاں تک ہر

ایک کے اندر ایسی قدرت معنویت، کشش، حیرت انگیزی، دلفریبی، حسن اور رعنائی ہے کہ ایک نظر ہی میں آدمی ان پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اور قدرت کی صناعی کے آگے سرافگندہ ہو جاتا ہے۔ ایک ایک پتہ ایک ایک بوٹہ زبردست قادر مطلق کی طرف اشارہ کرتا نظر آتا ہے۔ کائنات کی حیرت انگیزیاں ایک معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے اور بڑے سے بڑے فلسفی دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ جو جس قدر دیدہ ریزی اور تعمق کے ساتھ کسی شے کے جزیا کل پر تھوڑا سا تدبر یا تعقل کرتا ہے اسے اپنی کم مائیگی اور درماندگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور ضمیر پکار اٹھتا ہے "ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحنک فقنا عذاب النار" اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ عبث نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے، پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق پر بار بار غور کرنے کی تاکید فرماتا ہے۔ مگر لوگ غور نہیں کرتے اور جو کرتے ہیں انہیں ان کا رب مل جاتا ہے۔ دعوت کا زبردست اسلوب یہ ہے کہ انسانوں کو نظام آفاق و انفس پر غور کرنے پر اکسایا جائے۔ ان کے سامنے قدرت کے کرشمے کھول کھول کر بیان کئے جائیں۔ انسانی دل و دماغ کو حکیمانہ نظام عالم کی سیر پر تیار کیا جائے۔ قرآن نے زمین و آسمان، دریا پہاڑ، صحرا، جنگل، بارش، شبنم، ستارے، سیارے، ارضیات و فلکیات، گردش لیل و نہار، موسموں کی تبدیلی، پتھر اور انکی دھاریاں، پھلوں پھولوں کی خوشبو اور انکی رنگت وغیرہ پر توجہ دینے کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ انسان اگر غور و فکر پر آمادہ ہو جاتا ہے تو کب تک اور کہاں تک قدرت کے کرشموں سے چشم پوشی کرے گا۔ کبھی نہ کبھی انسانی ضمیر بالآخر حق کی نشاندہی کر ہی دے گا۔ پھر اس دروازہ سے خیر کی کرنیں اس کے اندر داخل ہو کر پوری زندگی کو روشن کر دیں گی۔ ,,ان فی خلق السمٰوٰت و الارض و اختلاف الیل و النھار و الفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس و ما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا و بث فیھا من کل دابۃ و تصریف الریاح و السحاب المسخر بین السماء و الارض لأیات لقوم یعقلون ،، بقرہ ۱۶۴، ترجمہ: جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لئے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کی نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کے جان دار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین

کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں۔ ,,انعام ۹۹، اعراف ۱۸۵ وغیرہ

(۲۱) مظاہر کے بجائے قلبی کیفیت اصل ہے۔

بر و تقویٰ اور خیر و صلاح (بقرۃ ۲۲۴) کی صفات عالیہ سے اللہ تعالیٰ انسانوں کو متصف بنانا چاہتا ہے۔ ان خوبیوں کو پیدا کرنے، جلا دینے اور ان کی بنیاد پر ایک صالح انسانی معاشرہ کی تشکیل کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اپنی کتابیں بھیجتا رہا ہے۔ یہ اوصاف انسانی فطرت کی آواز ہیں۔ عموماً ان اوصاف سے کسی کو چڑ نہیں ہوتی۔ ان اوصاف کی بنیاد پر بعض مظاہر اور اعمال تشکیل پاتے ہیں۔ لوگوں کو عام طور پر اختلاف ان مظاہر اور علامات سے ہوتا ہے۔

دعوت کی حکمت یہ ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں مظاہر اور علامات پر زور نہ دیا جائے۔ اصل بنیادی باتوں اور قلبی کیفیات پر دی جائے۔ قلوب کی تطہیر، حق پسندی، آخرت کی جواب دہی وغیرہ احساسات جیسے جیسے ابھرتے جائیں گے مظاہر میں اللہ و رسول کی تعلیمات کے آگے سر تسلیم خم ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر پہلے ہی مرحلے میں نماز کے آداب، زکوٰۃ اور اس کا نصاب، داڑھی کی اہمیت و مقدار، کچھ مراسم و روایات، ہیئتی تبدیلیاں وغیرہ جیسے مسائل چھیڑ دئے جائیں تو مخاطب قریب آنے کے بجائے دور بھاگ جائے گا۔ کیونکہ ابھی وہ اپنی قلبی کیفیت کے اظہار کے لیے بعض دوسرے مظاہر سے قلبی طور پر جڑا ہوا ہے۔ گویا پہلے ایمان و یقین کی تخم ریزی قلوب میں کی جائے، اس کے بغیر شاخوں اور پتیوں کی پیوند کاری دیر پا نہیں ہوگی۔ جڑیں اگر مضبوط ہوں گی تو ان سے شاخیں، کونپلیں اور پتیاں تو نکل ہی آئیں گی۔ ,,لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من امن باللہ والیوم الأخر والملائکۃ والکتب والنبیین، واتی المال علی حبہ ذوی القربیٰ والیتمیٰ والمسکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب، واقام الصلوۃ واتی الزکوۃ، والموفون بعھدھم اذا عاھدوا، والصابرین فی البأساء والضراء وحین البأس، اولئک الذین صدقوا و اولئک ھم المتقون،، ترجمہ: نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں، اور تنگی و مصیبت کے وقت

میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں - یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔ (بقرہ ۱۷۷)،، واذکروا اللہ فی ایام معدودت ،فمن تعجل فی یومین فلا اثم علیہ، و من تاخر فلا اثم علیہ لمن اتقی، واتقوا اللہ واعلموا انکم الیہ تحشرون،، ترجمہ: گنتی کے چند روز ہیں جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہئیں، پھر کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں، اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھہر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کیے ہوں۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔ (۲۰۳)

(۲۲) اسلام پیام رحمت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو منصب امامت پر سرفراز فرماتے ہوئے جو ہدایات دی ہیں ان کے اندر عوام و خواص کے لئے کافی کشش اور رہنمائی ہے۔ اسلام جس طرز کا معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے اس کے تعارف سے اسلام کی معقولیت مبرہن ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی سورہ بقرہ کے مطالعہ سے یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر انسان کو اپنا خلیفہ بنایا اور استحقاق خلافت کی کچھ شرطیں مقرر کیں ایک دور میں بنی اسرائیل کو منصب امامت پر مامور کیا، پھر جب بنی اسرئیل نے شرائط امامت و خلافت کو پامال کیا اور میثاق کو توڑا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کی قیادت میں ایک نئی امت برپا کی اور اسے امت وسط سے ملقب کر کے منصب امامت پر سرفراز فرمایا۔ ساتھ ہی اس منصب جلیل پر متمکن گروہ کے تفصیلی اوصاف بیان کئے۔ معاشرتی امور میں راہ عدل و قسط کی رہنمائی فرمائی۔ اس گروہ کی قلبی و عملی کیفیات پر روشنی ڈالی۔

ان مباحث اور ان کے نتیجہ میں وجود میں آنے والے معاشرہ کی خوبیاں خود اپنے اندر عوام الناس کے لئے زبردست کشش رکھتی ہیں۔ کسی معاشرہ کی خوبیاں عوام اپنی نظروں سے بھی دیکھتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور اگر کبھی وہ آئیڈیل معاشرہ موجود نہ ہو تو فکری اور نظری طور پر اس کے خدوخال بیان کر کے اور اس کی خوبیاں اجاگر کر کے عوام کو اس جانب راغب کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ذکر و شکر، صبر و صلوٰۃ، ابتلاء و آزمائش، شعائر اللہ کا احترام، حب خداوندی، حق پسندی، رزق حلال کی اہمیت، فحشاء و منکرات سے اجتناب، اظہار حق، تقویٰ و انابت، حق و انصاف کے لئے جدوجہد، فتنہ و فساد کا استیصال، ضبط نفس اور اطاعت کامل، آخرت کا استحضار، انفاق، جوا و شراب سے اجتناب، یتیموں کے ساتھ حسن سلوک، تمام انبیاء و کتب سماوی کی صداقت پر ایمان، دعوت اسلامی

میں زور و زبردستی سے پرہیز، کمزوروں کی دستگیری، بخل و حرص سے اجتناب، سود اور سودی ذہنیت سے گریز، توبہ و استغفار، معاملات میں اصول پسندی اور پاکیزگی وغیرہ۔

مثبت انداز سے اسلامی تعلیمات کے فیوض و برکات سے دل و دماغ کو متاثر کرنا اور اسلامی تعلیمات کی خوبیاں بیان کر کے غور و فکر کی دعوت دینا دعوتی عمل کا نمایاں اسلوب ہے۔

(۲۳) شکوک و شبہات کا ازالہ۔

داعی کو یہ کبھی نہیں سمجھنا چاہئے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے دعوت اسلامی کا فریضہ ادا ہو گا۔ اس راہ میں قسم قسم کی رکاوٹیں کھڑی کی جائیں گی۔ ہر رکاوٹ کو خوش اسلوبی کے ساتھ دور کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہو گا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جن عوام کو اسلام کے فیوض و برکات سے متعارف کرانے کی کوشش ہو گی ان کے ذہن کو منتشر کرنے اور ان کی یکسوئی کو متاثر کرنے کے لئے طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں گے۔ اسلامی تعلیمات، قرآنی آیات، مسلم معاشرہ، اسلامی تاریخ، مسلم شخصیات وغیرہ کے حوالے سے غلط فہمیوں کا طوفان کھڑا کیا جائے گا۔ جیسے اسلام زور زبردستی اور جنگ و جدال کی تعلیم دیتا ہے، ان کے یہاں مروج معروفات کا اہتمام نہیں ہوتا ہے، یہ ایک نیا دین گڑھا گیا ہے، یہ فرسودہ اور دقیانوسیت پر مبنی مذہب ہے وغیرہ۔

ابلیس اور اس کی فوج ہر دور کے لحاظ سے شکوک و شبہات، الزامات و اتہامات کی ایک ایسی لمبی چوڑی فہرست لے کر میدان میں کود پڑے گی جس کا پیشگی تصور بھی نہیں کیا گیا ہو گا۔ اس طوفان میں نہایت صبر و ضبط اور حکمت و دانائی کے ساتھ ان کے ہر وار کا بھرپور جواب فراہم کرنا ہو گا۔ اگر وہ کہیں کہ اسلام میں تشدد ہے، دہشت گردی اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے، عورتوں کے ساتھ ناانصافی کی تعلیم دیتا ہے، رجعت پسندی اسلام کا مزاج ہے، قرآن خود ساختہ کتاب ہے، یا اسی طرح کے دوسرے اعتراضات کریں تو دعوتی کام کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ رائج یا متوقع اعتراضات و شبہات کا تفصیلی علم حاصل کرے اور ان امور میں اسلام کی روشن اور بے داغ تعلیمات سے پہلے خود اچھی طرح مطمئن ہو۔ اور اسلامی احکامات کی حکمت کا فہم حاصل کرے۔ اور اس طرح کے اشکالات پر خود اچھی طرح غور کرتا رہے۔ پھر کس نوعیت کے سوالات کے کیا جواب مبنی بر حکمت ہوں گے، اس کو ذہن میں مستحضر کرتا رہے۔ اس طرح مخالفتوں کے طوفان میں خیر و خوبی کے ساتھ گزرتا ہوا اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

(۲۴) مختلف مذاہب و طبقات کے درمیان اختلافات کا تاریخی و

نفسیاتی تجزیہ

دعوت دین کے اصلاً اور عملاً مخاطب وہ لوگ ہیں جنہیں قرآنی اصطلاح میں ,,الناس،، کہا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر اپنے افکار و اعمال میں شدت نہیں ہوتی ہے۔ جب ان کے سامنے خدائی فرمان کے حوالے سے اسلام کی دعوت اور اس کی تفصیلات پیش کی جاتی ہیں تو بدیہی طور پر ان کے ذہنوں میں ایک سوال لازماً اٹھتا ہے کہ آخر دوسرے تمام مذاہب بھی تو خدا ہی کے بھیجے ہوئے ہیں، اور ان کی تعلیمات میں بھی کسی قدر یکسانیت پائی جاتی ہے۔ آخر ایک ہی مرکز سے نکلے ہوئے یہ بہت سارے ادیان کیوں ہیں؟ اور مذہبی لوگوں میں اختلاف کیوں ہیں؟ پھر اور آگے بڑھ کر بسا اوقات مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے اور سارے مذاہب کو ایک ثابت کرنے کی مخلصانہ کوشش ہونے لگتی ہے۔ اس لئے وحدت ادیان کے دلدل میں پھنس کر دعوت کا عمل پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ داعی کو مذاہب کی بنیاد، اس کے ارتقائی مراحل، اس میں اختلافات اور اختلافات کے وجوہ و اسباب، انسانی ہوا و ہوس کی آمیزش، چشمۂ صافی کو گدلا کرنے کی کوششوں وغیرہ کا اچھی طرح علم ہو۔ تاکہ مخاطب کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کی رعایت کرتے ہوئے سیدھے انداز سے اسلام کی معقولیت، ضرورت اور واحد راہ نجات کے طور پر پیش کر کے مخاطب کو مطمئن کیا جا سکے۔

یہ ایسا مسئلہ ہے کہ دنیا کے ہر خطے اور بطور خاص ہندوستان میں دعوت کے راہ کی بڑی رکاوٹ ہے۔ ایک بڑا طبقہ اپنی بنیادوں کو متزلزل دیکھ کر اس مقام پر ٹھہر جاتا ہے کہ سارے مذاہب کی تعلیم ایک ہے، پھر وہ اسلام کیوں قبول کرے؟۔ اس مرحلہ سے خیر و خوبی کے ساتھ گزرنے کے لئے مذاہب کی حقیقت اور ان میں انحرافات و اختلافات کا گہرا علم ضروری ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب جگہ جگہ نظر آئے گا۔ "کان الناس امة واحدة، فبعث الله النبين مبشرين و منذرين و انزل معهم الكتاب بالحق ليحكم بين الناس فيما اختلفوا فيه، وما اختلف فيه الا الذين اوتوه من بعد ما جاءتهم البينٰت بغياً بينهم، فهدى الله الذين آمنوا لما اختلفوا فيه من الحق باذنه والله يهدى من يشاء الىٰ صراط مستقيم" ترجمہ: ابتداء میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راہ راست پر بشارت دینے والے اور کج روی سے

ڈرانے والے تھے، اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے، ان کا فیصلہ کرے۔ (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتداء میں لوگوں کو حق بتایا نہ گیا تھا نہیں)، اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انہوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لئے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے، انہیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا، جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔

(بقرہ ۲۱۳، ۲۱۳ اور ۲۵۳، آل عمران ۱۹ وغیرہ)

(۲۵) سماج کے محروم طبقات کے لئے اسلام کی مراعات

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کی بعثت کا ایک بنیادی مقصد یہ قرار دیا ہے کہ وہ روئے زمین سے انسانوں کے درمیان ظلم و ناانصافی کو ختم کر کے حق و انصاف کی بنیاد پر ایک مثالی معاشرہ تشکیل دیں۔ ظلم و استحصال کے خلاف اگر مسلح جدوجہد بھی کرنی پڑے تو کریں۔ اسلام صرف اپدیشوں اور وعظ و نصیحت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک نظام عدل و قسط ہے۔ عدل و قسط کا قیام اس کا اولین ہدف ہے۔ اسلامی تعلیمات عدل و قسط پر مبنی ہیں۔ اس حقیقت کو قرن اول کے مسلمان ان الفاظ میں بیان کرتے تھے "ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں لانا چاہتے ہیں" ہر دور میں کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی تہذیب و روایات کے حوالے سے ذہین طبقہ عوامی استحصال کے لئے نظام بناتا رہا ہے اور اس کے اوٹ میں مراعات حاصل کرتا رہا ہے۔ طبقۂ عوام اکثر نادانی کے سبب اور کبھی مجبوراً طوعاً و کرہاً سماجی بندھنوں کے تحت غلامی کی زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ مگر آزادی، انصاف اور مساوات یہ آفاقی قدریں ہیں اور انسانی فطرت کی مانگ ہیں۔ جب بھی اس کے لئے آواز بلند کی گئی ہے عوام نے بھرپور حمایت کی ہے اور حصول انصاف کے لئے سرگرم جدوجہد بھی کرتی رہی ہے۔

جن عوام کے درمیان اسلام کا پیغام پیش کرنا ہے ان کی اکثریت کسی نہ کسی حیثیت سے ظلم و ناانصافی کا شکار رہتی ہے۔ داعی کو اس فطری طلب کو ابھارنا اور ظالمانہ نظام کی خرابیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اسلام کے نظام عدل و قسط کو پیش کرنا ہے۔ دعوت کا یہ اسلوب مدعو افراد و طبقات کے لئے زبردست کشش رکھتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے ان طبقات کے حقوق و مراعات کو بالتعیین نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کئے ہیں جو سماجی انصاف سے محروم تھے۔ مثلاً خواتین، غلام، قیدی اور یتامیٰ وغیرہ۔

خواتین سماج کا نصف حصہ ہیں۔ اگر ان کو اسلام میں ان کے مقام بلند کو سمجھا دیا جائے تو

بلاشبہ وہ تیزی کے ساتھ آغوشِ اسلام میں آسکتی ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے تناظر میں دلت اور پس ماندہ طبقات۔ غرضیکہ دنیا کے مختلف علاقوں اور خطوں کے پس منظر میں متعین طریقہ کار وضع کیا جاسکتا ہے۔ آج کی دنیا میں اس حکمت عملی کا جگہ جگہ مشاہدہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیات ۲۲۰،۲۲۲،۲۲۳،۲۷۵،۲۷۶،۲۷۷ وغیرہ۔ ”ویسئلونک عن الیتمیٰ، قل اصلاح لھم خیر، وان تخالطوھم فاخوانکم، واللہ یعلم المفسد من المصلح، ولو شاء لاعنتکم، ان اللہ عزیز حکیم۔“ ترجمہ: پوچھتے ہیں یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہو جس طرز عمل میں ان کے لئے بھلائی ہو وہی اختیار کرنا بہتر ہے۔ اگر تم اپنا اور ان کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر وہ تمہارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ برائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔ اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا، مگر وہ صاحب اختیار ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب حکمت بھی ہے۔

(۲۶) کٹ حجتی سے اجتناب (مجادلہ)

انبیاء کرام کے طریقۂ دعوت میں جگہ جگہ یہ بات نظر آئے گی کہ انہوں نے سرداران قوم ملأ قوم، اور سربراہان مملکت کو مخاطب کیا ہے۔ ان سے دوبدو بحث و گفتگو کی ہے۔ حالانکہ اس بحث و جدال کا فائدہ اس طبقہ کو نہیں پہنچ سکا البتہ عوام الناس کا ایک تیسرا طبقہ جو بہت توجہ اور انہماک کے ساتھ اس پوری کارروائی کا بغور مشاہدہ کرتا رہتا ہے وہ براہ راست اس بحث و جدال سے متاثر ہو کر دامن اسلام میں پناہ لیتا رہا ہے۔

جن سربراہان قوم سے گفتگو ہوتی ہے ان کی ذاتی و نفسیاتی کیفیت بات نہ ماننے اور ضد و ہٹ دھرمی کی ہوتی ہے۔ اکثر خود ساختہ دام فریب میں عوام کو مبتلا کرکے یہ طبقہ ان کا استحصال کرتا رہا ہے۔ اس مراعات یافتہ طبقہ سے تو خیر کی زیادہ امید نہیں کی جاسکتی البتہ اس گفتگو اور بحث و جدال سے معاشرے کے طبقۂ اعلیٰ کی استحصالی ذہنیت عوام کے سامنے ضرور آجاتی ہے۔ لہٰذا اس ملأ قوم سے داعی کو ضرور گفتگو کرنی چاہیے بلکہ دعوت کا آغاز یہیں سے ہونا چاہیے اور بحث کا پس منظر ایسا بنانا چاہیے کہ عوامی دلچسپی اور توجہ اس میں شامل ہو سکے۔ البتہ مباحثہ میں کمال حکمت کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے متعارف کرانا ہوتا ہے۔ اس تعارف میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ اگر داعیانہ حکمت ہمراہ نہ ہو تو طبقۂ اعلیٰ کی جانب سے ایسے نکات ابھار دئے جاتے ہیں کہ بات منفی رخ پر چلی جاتی ہے۔ کوشش ہونی چاہیے کہ جب محسوس ہونے لگے کہ مخاطب کٹ حجتی پر آمادہ ہو گیا ہے تو

بات کو رخ دوسری جانب پھیرتے ہوئے کوئی دوسرا وار کر دیا جائے۔ اس طرح وہ زچ ہو جائے گا اور لاجواب ہو جائے گا۔ ساتھ ہی عوام پر داعی کی فکری، نظری، اور عملی بالادستی کا سکہ بیٹھ جائے گا۔ بطور مثال ملاحظہ ہو ”الم تر الی الذی حاج ابراھیم فی ربہ ان آتٰہ اللہ الملک، اذ قال ابراھیم ربی الذی یحی و یمیت قال انا احی و امیت، قال ابراھیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب فبھت الذی کفر واللہ لا یھدی القوم الظالمین۔ (البقرۃ ۲۵۸)۔“ ترجمہ: کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا اس بات پر کہ ابراہیم کا رب کون ہے اور اس بنا پر کہ اللہ نے اسے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا، ”زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے“، ابراہیم نے کہا، ”اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا“، یہ سن کر وہ منکر حق ششدر رہ گیا، مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔“ اسی طرح حضرت موسیٰ اور دیگر انبیاء کے طریقۂ دعوت میں اس اسلوب کو سمجھنا اور اس کی روشنی میں طریقۂ دعوت مرتب کرنا داعی کا کام ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

(۲۷) مباہلہ

ابتہال کے معنی دعاء و تضرع کے ہیں۔ دعوت کا ایک مرحلہ ایسا بھی آسکتا ہے کہ اس میں مخاطب سے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اگر تم اپنے آپ کو برسرحق سمجھتے ہو تو آؤ ہم تم مل کر دعاء کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کا غضب نازل ہو جائے۔

مباہلہ دعوت کا ایک مخصوص اسلوب ہے۔ اس کا استعمال ہر مخاطب کے لئے نہیں کیا جاتا۔ یہ مباہلہ ان لوگوں کے ساتھ ہو سکتا ہے جو خدا پر یقین رکھتے ہوں اور کسی درجہ میں ان کے اندر خوف خدا پایا جاتا ہو، اور جن کے قلوب میں لینت اور گداز کی کیفیت محسوس کی جائے۔ یا جو کسی درجہ میں اپنے معتقدات میں متزلزل ہوں یا جن پر اسلام کی حقانیت واضح ہو مگر بعض حجابات و تعصبات کے سبب سیدھے طریقہ سے قبول حق پر آمادہ نہ ہوں۔ ان بنیادی اوصاف کے حامل مدعوین کے لئے افہام و تفہیم کے معروف طریقے اختیار کر لینے کے بعد ایک مرحلہ پر مباہلہ کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ اس منزل پر مخاطب اپنے اندرونی کیفیات کے سبب میدان سے راہ فرار اختیار کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے ضمیر کی آواز اور خدا کے عذاب کے سامنے ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔

بلاشبہ وفد نجران کو آنحضورﷺ نے مباہلہ کی دعوت دی مگر اس وفد میں کس طرح کے لوگ شامل تھے، آپ نے تبادلۂ خیال اور گفتگو کے بعد ان کے اندر کیا کیفیات محسوس کیں: اس پورے پس منظر کو سامنے رکھے بغیر مباہلہ کا اسلوب نہیں اپنایا جا سکتا۔ گرچہ حضورﷺ کی پوری دعوتی زندگی میں وفد نجران کے ساتھ یہ ایک ہی واقعہ ہے، کوئی مستقل طرزِ عمل نہیں ہے لیکن بہرحال یہ ایک طریقہ ہے جسے داعی مناسب موقع و محل سے استعمال کر سکتا ہے۔ "فمن حاجک فیه من بعد ما جاءک من العلم فقل تعالوا ندع ابناء نا و ابناء کم و نساء نا و نساء کم و انفسنا و انفسکم، ثم نبتهل فنجعل لعنة الله علی الکاذبین " (آل عمران ۶۱) ترجمہ: یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی اس معاملہ میں تم سے جھگڑا کرے تو اے نبیؐ! اس سے کہو، آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں۔ اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

(۲۸) کلمۂ سواء

سورہ بقرہ کی بعض آیات کے حوالے سے گزشتہ اوراق میں مسلمات سے مقتضیات پر استدلال۔ کا ایک اسلوب گزر چکا ہے۔ یہاں کلمہ سواء پر گفتگو پیش نظر ہے۔ سواء کے معنی درمیان، بیچ، برابر، یا مشترک کے ہیں۔ کلمہ سواء کا مطلب یہ ہے کہ ایسی بات جو مختلف افراد اور فریقوں کے درمیان قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہو۔ ایک داعی شرح صدر کے ساتھ لوگوں کو اسلام کی صداقت و حقانیت کی طرف بلاتا ہے۔ کلمہ سواء کا اسلوب ان مخاطبین کے لئے مفید اور کارگر ہے جو توحید اور شرک کا واضح تصور رکھتے ہوں، جن کتابوں میں وحدانیت کی تعلیم صاف صاف موجود ہو۔ موقع محل کے اعتبار سے اہل کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ تورات و انجیل پر ان کا ایمان تھا۔ تورات میں متعدد مقامات پر غیر مبہم انداز سے توحید خالص اور اس کے مقتضیات بیان ہوئے ہیں۔ انا جیل میں بھی توحید خالص کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ گرچہ فتنہ پرور افراد نے توحید کی واضح تعلیمات کو تثلیث کے فاسد قالب میں ڈھالنے کی کوششیں کی ہیں مگر اصل اور تحریف کا فرق جگہ جگہ صاف نظر آتا ہے۔ قرآن نے گو کہ اہل کتاب کو مخاطب کیا ہے لیکن دیکھا جائے تو دیگر مذاہب میں بھی توحید خالص کی تعلیمات موجود ہیں۔ مثلاً ویدوں میں صاف صاف وحدانیت کا سبق دیا گیا ہے۔

چنانچہ جہاں کہیں بھی اور جس طبقہ میں بھی اسلام کی بنیادی تعلیمات سے توافق محسوس ہو اسے بنیاد بنا کر دعوت دی جانی چاہئے۔ یہی کلمہ سواء ہے۔ توحید پر ایمان رکھنے والا شرک نہیں کر سکتا

اس کی نفی کرنا چاہئے، خواہ یہ شرک اعتقادی ہو یا عملی۔ اللہ کو سب کچھ تسلیم کرتے ہوئے اپنے ارباب من دون اللہ کو قانون سازی کا حق دینا اں پر اندھا اعتماد کرتے ہوئے ان تمام باتوں کو تسلیم کرنا جو عقیدۂ توحید سے متعارض ہیں کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ "قل یا اهل الکتاب تعالوا الیٰ کلمة سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا الله ولا نشرک به شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله، فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون "(آل عمران ۶۴) ترجمہ: اے نبیؐ کہو، اے اہل کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی اور اطاعت کرنے والے) ہیں۔

(۲۹) حادثات و واقعات سے عبرت

دعوتی جدوجہد کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے طرح طرح کے واقعات و حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان واقعات و حادثات یا ارضی و سماوی آفات و عنایات کے پس منظر میں انسانوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے خیالات ابھرتے ہیں۔ واقعات کی مختلف تاویلیں کی جاتی ہیں۔ ان حالات سے گزرتے ہوئے داعی گروہ نہایت حکمت کے ساتھ رونما ہونے والے واقعات کو دعوت الی اللہ کے حق میں استعمال کرتا ہے۔ قحط سالی کی دوسرے لوگ کچھ بھی تاویل کریں داعی اس کی اسلامی تعبیر کر کے لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اسی طرح سیلاب، طوفان، خشک سالی، بیماری، وبائی امراض، زلزلہ، دیگر مصائب و مشکلات۔ ہر موقع اپنے ساتھ عبرت کا کافی سامان رکھتا ہے لیکن ان مواقع پر عبرت حاصل کرنے، عبرت حاصل کرنے کے لئے لوگوں کو متوجہ کرنا اور واقعات کی داعیانہ تعبیر کرنا دعوت کا بہترین اسلوب ہے۔ ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے قریب کیا جا سکتا ہے کیونکہ مصیبت میں کچھ طبعی میلان بھی اللہ کی طرف ہوتا ہے۔

اس طرح بعض واقعات سے استدلال کرتے ہوئے طبقۂ مسلمین کو برحق ثابت کیا جا سکتا ہے اور گروہ مخالف پر غضب خداوندی کے لئے استدلال ہو سکتا ہے۔ ان مواقع کا استعمال ہونا چاہئے۔ "قد کان لکم اٰیة فی فئتین التقتا، فئة تقاتل فی سبیل الله واخری کافرة یرونهم مثلیهم رای العین، والله یوید بنصره من یشاء، ان فی ذالک لعبرة لاولی الابصار "(آل عمران ۱۳) ☆☆

علوم حدیث میں شاہ ولی اللہؒ کی خدمات

مولانا انیس احمد مدنی

ظہور ولی اللہ کے وقت ہندوستان کی تعلیمی صورت حال

شاہ ولی اللہؒ کے ظہور کے وقت ہندوستان میں سیاسی و اخلاقی انحطاط و زوال کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی علمی و تعلیمی حالت بھی حد درجہ انحطاط پذیر تھی، درسگاہوں میں صدرا، شمس بازغہ اور شرح مطالع کے حواشی و شروح بکثرت رائج تھے اور اصل علوم (کتاب وسنت کی طرف) کوئی توجہ نہ تھی، سید عبدالحئی کے بقول:

"جب سندھ میں عربوں کی حکومت ختم ہوگئی اور ان کے بجائے غزنوی اور غوری سلاطین سندھ پر قابض ہوئے اور خراسان اور ماوراء النہر سے سندھ میں علماء آئے تب علم حدیث اس علاقہ میں کم ہوتا گیا، یہاں تک کہ معدوم ہوگیا اور لوگوں میں شعر و شاعری، فن نجوم، فن ریاضی اور علوم دینیہ میں فقہ و اصول فقہ کا رواج زیادہ ہوگیا، یہ صورتحال عرصہ تک قائم رہی، یہاں تک کہ علمائے ہند کا خاص مشغلہ یونانی فلسفہ رہ گیا اور علم تفسیر و حدیث سے غفلت بڑھ گئی، مسائل فقہیہ کے سلسلے میں جو تھوڑا سا تذکرہ کتاب وسنت میں آجاتا تھا بس اسی مقدار پر قانع تھے، فن حدیث میں امام صغانی کی "مشارق الانوار" کا رواج تھا، اگر کوئی شخص اس فن میں زیادہ ترقی کرتا تھا تو امام بغوی کی "مصابیح السنۃ" یا "مشکوٰۃ" پڑھ لیتا تھا اور ایسے شخص کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ محدث ہوگیا اور یہ سب محض اس لیے تھا کہ لوگ عام طور پر ہندوستان میں اس فن کی اہمیت و مرتبت سے ناواقف تھے، وہ لوگ اس علم کی طرف سے بالکل غافل تھے نہ اس علم کے ائمہ کے حال سے واقف تھے اور نہ اس علم کا ان کے درمیان کوئی چرچا تھا، محض تبرکاً مشکوٰۃ شریف پڑھا کرتے

تھے، ان کے لیے سب سے زیادہ سرمایہ علم فقہ کی تحصیل تھا اور وہ بھی تقلید کے طور پر، تحقیق کے طور پر نہیں، اسی وجہ سے اس زمانہ میں فتاویٰ اور روایات فقہیہ کا رواج بڑھ گیا تھا، نصوص و محکمات متروک ہوگئی تھیں، مسائل فقہیہ کی صحت کو کتاب وسنت سے جانچنا اور فقہی اجتہادات کو احادیث نبویہ سے تطبیق دینے کا طریقہ متروک ہوگیا تھا۔" (الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند)

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں:

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا، مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا، جھوٹے فقراء اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسند بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پرشور تھا، فقہ و فتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی، مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا، عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب اور احادیث کے احکام و ارشادات اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے۔"

(مقالات سلیمان ۲/۴۴)

اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی کیا کیفیت تھی اور کس ماحول میں شاہ صاحب نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔

علوم حدیث میں شاہ صاحب کا مقام و مرتبہ

شاہ صاحب تفسیر و فقہ و حدیث میں اجتہاد کے مقام پر فائز تھے، آپ کے اساتذہ اور سوانح نگاروں نے فن حدیث میں آپ کی مہارت کی شہادت دی ہے، آپ کے استاذ ابوطاہر محمد بن ابراہیم الکردی کہتے ہیں: "انہ کان یسند عنی اللفظ وکنت أصحح منہ المعنی" وہ (شیخ ولی) مجھ سے الفاظ حدیث کی سندیں لے رہے تھے اور میں ان سے مفاہیم حدیث کی تصحیح کر رہا تھا، آپ کی یہ شہادت امام بخاریؒ کی اپنے شاگرد ابو عیسیٰ کے حق میں اس شہادت کے مانند ہے:

"ما انتفعت بک أکثر مما انتفعت بی" (نزہۃ ۶/۴۰۳)

ابجد العلوم میں ہے: "آپ علوم شرعیہ کے ماہر اور حدیثی مباحث کے بحر بیکراں تھے" (ص ۱۴۲)

علامہ عبدالحی لکھتے ہیں: آپ کو حفظ متون، ضبط اسانید، مسانید ومجامیع کے احوال و کیفیت سے گہری واقفیت اور علوم حدیث واثر پر فنی مہارت حاصل تھی، ہندوستان کے کسی اور محدث کو دور دراز کے علاقوں میں احادیث کی روایت کا وہ شرف حاصل نہ ہوا جو آپ کو حاصل ہوا۔ (نزہۃ ۶، ص ۴۰۱)

چنانچہ آپ کی تحدیث کا غلغلہ ہندوستان اور اس کے باہر عرب وعجم تک پہنچا، جیسا کہ آپ کے شاگردوں کے سلاسل اور آپ کی تصانیف حدیث کی مقبولیت سے ثابت ہے، ہندوستان میں آج جو علم وحکمت باقی ہے وہ حضرت شاہ صاحب کا صدقہ ہے، بالخصوص علم حدیث کا اس ملک میں جو چرچا ہے اور بارہویں صدی سے آج تک پوری دنیائے اسلام میں علماء ہندوستان کو جو خصوصی امتیاز رہا ہے..... وہ سب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا رہین منت ہے۔

حرمین سے واپسی کے بعد شاہ صاحب نے خدمت حدیث اور اس کی نشر واشاعت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا، جس کا مختصر خاکہ ہدیۂ قارئین کیا جارہا ہے۔

علم حدیث کی اہمیت و حجیت کا اظہار و اثبات

آپ نے اپنی متعدد کتابوں اور وصیتوں میں دین میں حدیث کے صحیح مقام، اس کی حجیت اور تشریعی حیثیت پر بھرپور روشنی ڈالی۔

حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: ''اس کے بعد بندہ فقیر کہتا ہے کہ تمام علوم یقینیہ اور فنون دینیہ میں سب سے عمدہ اور ان کا امام علم حدیث ہے جس میں جناب افضل المرسلین کے قول وفعل وتقریر کا بیان ہوتا ہے تو اس طرح وہ (افعال واقوال) ظلمت کے چراغ اور ہدایت کے راستوں کے عمدہ منار ہیں گویا ماہتاب جہانتاب ہیں'' (۲/۱)

تفہیمات الٰہیہ میں ہے شریعت کے اصول دو ہیں (۱) آیات محکمہ (۲) سنۃ قائمہ، ان دونوں کے سوا کوئی اور شے دین میں مسلم نہیں، ان غیر مسلمہ امور میں رائے دین میں تحریف ہے مگر یہی رائے قضایا میں مستحسن ہے، ''تفہیمات'' میں آپ نے حدیث کے مقابلے میں کسی فقہی رائے پر عمل کو اس دلیل کے ساتھ کہ ائمہ فقہ سے یہ حدیث پوشیدہ نہیں تھی، لہٰذا انہوں نے اس حدیث پر عمل نسخ یا کسی اور وجہ ترجیح کی بنا پر چھوڑا ہوگا خلاف دین قرار دیا ہے۔

احادیث اور قرآن میں باہمی ربط

قرآن وحدیث میں متن وشرح کا ربط ہے، اہل سنت کا یہی موقف ہے، جس کی ترجمانی

علامہ شاطبیؒ نے یوں کی ہے ''فکان السنۃ بمنزلۃ التفسیر والشرح لمعانی احکام الکتاب'' (الموافقات ج۴ ص ۱۰) گویا سنت کتاب اللہ کے احکام کے لیے بمنزلہ تفسیر وشرح ہے۔

اس رائے کا سب سے پہلے تحریری اظہار امام شافعیؒ نے الرسالہ میں کیا تھا (ص ۳۲) شاہ صاحب کے نزدیک بھی حدیث کے تمام ابواب کتاب اللہ سے مستنبط ہیں، اپنی کتاب خیر کثیر میں فرماتے ہیں: ''میں کتاب الصلوۃ کے متعلق تمام صحیح حدیثوں کو قرآن سے مستنبط کرنے پر قادر ہو گیا ہوں، میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے متعلق ایک رسالہ لکھ دوں'' (الخیر الکثیر ص ۸۷)

احادیث نبویہ کی تشریعی حیثیت

اہل سنت کے موقف کی ترجمانی کرتے ہوئے شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں احادیث کی دو قسمیں کی ہیں۔

۱۔ ایک وہ جو منصب نبوت سے تعلق رکھتی ہیں، ان کی نسبت خدا کا ارشاد ہے کہ

''ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا'' (الحشر: ۷)

۲۔ دوسری وہ احادیث جن کا تعلق فریضہ تبلیغ رسالت سے نہیں ہے، اس قسم میں تابیر نخل کا واقعہ، طب وصحت سے متعلق باتیں، انسانی تجربات سے تعلق رکھنے والے امور بر بنائے عادت واتفاق انجام پانے والی چیزیں، یا جو باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزعومات کے موافق بیان کیں، یا جو باتیں کسی جزئی مصلحت کے موافق اختیار کیں مثلاً لشکر کشی اور اس قسم کے اور بہت سے احکام، اس قسم کے تعلق سے خود حضور پر نور علیہ الصلوۃ والسلام کی ہدایت تھی کہ:

''إنما أنا بشر إذا أمرتکم بشيء من دینکم فخذوا بہ وإذا أمرتکم بشيء من رأی فإنما أنا بشر'' (صحیح مسلم)

تدریس حدیث

حرمین سے ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ میں وہ دہلی واپس آئے (الجزء اللطیف ص ۶) اور اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں حدیث کا درس دینا شروع کیا اور واپسی کے بعد آپ نے اپنی پوری زندگی حدیث کی نشر واشاعت اور سنت کی پیروی میں صرف کر دی کیونکہ واپسی کے وقت ہی آپ نے فیصلہ کر لیا تھا ''ہرچہ خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دین حدیث'' میں نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھلا دیا بجز علم حدیث'' (ملفوظات ص ۴۳) اس وقت دینی مدارس میں حدیث کی طرف خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی، چنانچہ آپ نے دینی مدارس کے نصاب میں بھی اصلاح کی موطا امام مالک

اور صحاح ستہ وہ سنا پڑھانے کی طرح ڈالی، جس سے طلبا جوق در جوق اطراف سے آکر مستفید ہونے لگے، طلباء کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا، اس لیے کچھ عرصہ بعد یہ جماعتیں ایک وسیع عمارت میں منتقل کر دی گئیں جو محمد شاہ نے اس مقصد کے لیے دی تھی، مولوی بشیر صاحب لکھتے ہیں: ”محمد شاہ نے مولانا کو بلا کر شہر میں ایک عالی شان مکان دے کر آپ کو اندرون شہر رکھا، قدیم محلہ خیر آباد ہو گئی (دار الحکومت دہلی ۲ ص ۲۸۶) یہ مدرسہ کسی زمانہ میں نہایت عالیشان اور خوبصورت تھا اور بڑا دار العلوم سمجھا جاتا تھا (نفس مصدر)

طریقۂ تدریس

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ”حرمین میں درس حدیث کے تین طریقے ہیں (۱) سرد (۲) بحث و تحقیق (۳) درس حدیث کا وہ طریقہ ہے جس کا نام امعان و تعمق کا طریقہ ہو سکتا ہے، یعنی ہر ہر لفظ اور اس کے متعلقات پر مالہ اور ماعلیہ پر بحث کی جائے، اس تیسرے طریقے کو شاہ صاحب نے واعظوں و قصہ خوانوں کا طریقہ قرار دیا ہے اور دوسرے طریقے کو مبتدیوں کے لیے مفید بتایا ہے اور پہلا طریقہ دورۂ حدیث کے لیے قرار دیا ہے (اتحاف النبیہ) شاہ صاحب کے یہاں مشکوٰۃ شریف بحث و تحقیق سے اور صحاح ستہ سرداً ہی پڑھائی جاتی تھی، البتہ صحاح ستہ کی ہر کتاب کی کچھ خصوصیات ہیں، ان سے طلبہ کو متنبہ کیا جاتا تھا۔

احادیث سے ماخوذ مسائل فقہ پر بحث کرتے وقت آپ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان پر مذاہب اربعہ میں جو اختلاف پایا جاتا ہو اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے بجائے کم سے کم رکھا گیں اس مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ ایسے تمام فقہی مسائل کے صرف ان پہلوؤں پر بہت زور دیتے اور ان کا تجزیہ کرتے تھے جن میں اتفاق رائے پایا جاتا تھا اور کسی ایک مسلک کو دوسرے پر فوقیت نہ دیتے تھے، یہ ایک ایسا طریقہ تعلیم تھا جس سے نوجوان طلبہ میں وسیع النظری پیدا کرنے میں بہت مدد ملتی تھی۔

روایت حدیث

احادیث کی تدوین و تالیف کے بعد بھی ان مجموعہائے احادیث سے شغف و رغبت اور برکت کے حصول کے لیے محدثین نے ان مجموعہائے حدیث کے مؤلفین سے بذریعہ سماع یا اجازۃ متصل سندوں سے حدیثوں کی روایت کا سلسلہ جاری رکھا اور ہر محدث اپنے شاگرد کو اس کی تلقین کرتا رہا، چنانچہ امام عبدالحق محدث دہلوی کہتے ہیں:

”میرے آقا عبدالوہاب المتقی نے مجھے اس بات کی وصیت کی کہ

محدث کے لیے مناسب یہ ہے کہ اسے اپنے شیوخ سے جو متصل سندیں ملی ہیں ان میں سے کسی ایک کی حفاظت کرے تاکہ اس کا سلسلہ سند سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے متصل رہے اور اس کی برکت اس کے حامل کو دنیا و آخرت میں ملے۔“ (الکتانی ج ۲ ص ۲۷۷)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حرمین سے واپسی کے بعد حرمین کے اپنے شیوخ سے حاصل شدہ مشہور کتب احادیث کی روایت کی اجازت کے بعد دہلی میں مدرسہ رحیمیہ میں بذریعہ اجازۃ روایت حدیث کا سلسلہ شروع کیا، اجازۃ، حدیث کے اخذ کرنے کے مشہور آٹھ طریقوں میں سے ایک طریقہ کا نام ہے اور جمہور محدثین کے نزدیک اس کے ذریعہ روایت کرنا جائز ہے (الالماع ۸۹، اختصار علوم الحدیث/ ۱۱۹) شاہ صاحب کا سلسلہ سند بھی عالی ہے اور اس کے جملہ رواۃ مشہور محدثین و علماء ہیں، کوئی دوسرا سلسلہ سند اس کی ہمسری نہیں کر سکتا، ثلاثیات بخاری، شاہ صاحب کے سند میں صرف چودہ واسطوں سے مروی ہے۔

شیخ عبدالحی الکتانی نے شاہ ولی اللہ سے مروی اپنے سلسلہ سند کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ”میرے نزدیک اس سلسلہ سند سے زیادہ شیریں اور عظیم کوئی سند نہیں ہے کیونکہ اس کے جملہ رجال ائمہ دین اور دعاۃ ہیں۔ (الکتانی ج ۲ ص ۱۷۹)

گویا اس سلسلہ سند میں رواۃ کی قلت اور ان کے وثوق و عدالت کے ساتھ ساتھ اہل علم کے درمیان ان کا تقدو اتقان میں مشہور ہونا بھی پایا جاتا ہے اور علو و اسناد میں ان تمام خوبیوں کا پایا جانا کیا ہی خوب ہے۔ (دیکھیے مقدمہ جامع الاصول: ۳۲)

شاہ ولی اللہ الدہلوی نے حرمین کے اپنے شیوخ کے سلسلہ سند سے صحاح ستہ کے علاوہ مسند الدارمی، موطا محمد، آثار محمد، مسند الشافعی، مسند احمد، مسند ابی یعلی الموصلی، مسند ابی داؤد الطیالسی، صحیح ابن حبان، سنن الدارقطنی، المستدرک للحاکم، الحلیۃ للحافظ ابی نعیم، السنن الکبری والصغری للبیہقی، مؤلفات خطیب، مشارق الانوار للصغانی، الترغیب والترہیب للمنذری والمختارۃ للحافظ ضیاء الدین المقدسی کو بذریعہ اجازۃ ہند و بیرون ہند میں عام کیا، جس سے ان کتابوں کی ترویج و اشاعت اور ان کے مطالعہ کا ایک عمومی رجحان پیدا ہوا، آپ کے سلسلہ سند کی مقبولیت کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیں جو امیر الروایات میں مذکور ہے، مولانا قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے امیر خان نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ سفر حج میں حضرت کا جہاز یمن کے ساحل سے کسی بندرگاہ پر ٹھہر گیا،

معلوم ہوا کہ چند دن ابھی رکا رہے گا، حضرت نانوتوی کو کسی نے خبر دی کہ اس بندرگاہ کے شہر میں ایک کہنہ سال معمر بزرگ محدث رہتے ہیں، ان کی ملاقات کو حضرت تشریف لے گئے بلکہ مولانا نانوتوی ان کے علم سے بہت متاثر ہوئے اور درخواست کی کہ حدیث کی سند کی اجازت عطا ہو، اس پر محدث صاحب کے شاگردوں نے پوچھا کہ تم کس کے شاگرد ہو؟ انہوں نے اپنے استاذ مولانا عبدالغنی مجددی کا نام لیا، محدث صاحب ناواقف تھے، پوچھا مولانا عبدالغنی کس کے شاگرد ہیں؟ جواب ملا شاہ اسحق صاحب کے، شاہ اسحق صاحب سے بھی وہ ناواقف تھے، پوچھا وہ کس کے شاگرد تھے؟ کہا شاہ عبدالعزیز صاحب کے، شاہ عبدالعزیز صاحب کا نام سن کر محدث صاحب رکے، بولے میں ان کو جانتا ہوں اور اس کے بعد فرمایا، شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے، جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں جنت نہیں ہے، یوں ہی جہاں شاہ ولی اللہ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلہ نہیں ہے وہاں جنت نہیں ہے۔

(امیر الروایات ص ۱۵۰)

اصول حدیث

اصول حدیث پر بھی آپ کو گہرا ادراک حاصل تھا، اور اس فن میں آپ اجتہاد کے منصب پر فائز تھے، آپ کے فرزند عبدالعزیز کہتے ہیں ”اس فن میں شیخ کی بعض تحقیقات بالکل نادر و اچھوتی ہیں اور بعض دقیق فنی بحثیں ایسی ہیں جن تک کسی کی رسائی نہیں جاتی تھی“ (الیانع الجنی: ۱۲۴)

آپ نے اصول حدیث کے متعدد مباحث اور اس کی بعض انواع پر مستقل رسالے لکھے ہیں جو درج ذیل ہیں:

الارشاد الی مہمات الاسناد (عربی)..... اسناد کے موضوع پر یہ انتہائی مختصر تالیف ہے، اس میں آپ کے اساتذہ اور ان شیوخ کا بیان ہے جن کے واسطے سے آپ نے جملہ کتب حدیث کی روایت کی اجازت حاصل کی تھی، آپ نے اپنے اساتذہ وشیوخ کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔

طبقہ اولیٰ: حرمین کے ان سات شیوخ پر مشتمل ہے جن تک آپ کا سلسلہ سند الشیخ ابو طاہر المدنی، شیخ سید عمر بن بنت الشیخ، شیخ تاج الدین قلعی اور شیخ محمد وفد اللہ مکی کے واسطوں سے پہنچتا ہے، اور دوسرا طبقہ دونوں اماموں قاضی زین زکریا الانصاری اور امام سیوطی تک پہنچتا ہے اور تیسرا طبقہ ان دونوں سے کتب احادیث کے مؤلفین تک پہنچتا ہے۔

رسالہ کے پیش لفظ میں آپ نے اسناد کی تعریف، اہمیت وضرورت پر انتہائی اختصار کے

ساتھ عالمانہ گفتگو کی ہے، یہ رسالہ لاہور سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔

۲۔ ماتجب حفظہ للناظر (فارسی)..... اس میں اصول حدیث کے بعض قواعد بیان کیے ہیں جن کا جاننا ہر طالب حدیث کے لیے ضروری ہے، اس میں نادر اور اچھوتی تحقیقات بھی شاہ صاحب نے بیان کی ہیں، ثقافۃ الہند میں ہے:

”یہ رسالہ نرالی تحقیقات اور اچھوتی تدقیقات پر مشتمل ہے“ (۱۶۱)

۳۔ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ واسانید وارثی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (فارسی)..... یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں سلاسل اولیاء کا تذکرہ ہے، دوسرے حصے میں فقہ اور اجتہاد کے متعلق مباحث ہیں۔

دوسرا اور تیسرا حصہ اتحاف النبیہ کے نام سے (عربی میں) مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حواشی کے ساتھ مکتبہ سلفیہ لاہور سے شائع ہوا ہے۔

۴،۵،۶۔ مجموعہ مسلسلات.....

اصطلاح محدثین میں مسلسلات، سلسلۂ احادیث کی ایسی روایات کو کہا جاتا ہے جس میں اس روایت کے راویوں نے اس روایت یا مجموعہ روایات کی نقل و اجازت کے ساتھ کسی خاص مناسبت کا اہتمام کیا ہو اور وہ سلسلہ اور مناسبت قدیم راویوں سے اس کے آخری راوی یا عصر حاضر تک اسی مناسبت اور اہتمام کے ساتھ نقل ہو رہی ہو۔

اصول حدیث کی قدیم کتابوں میں جہاں جہاں متن حدیث کی کتابوں کی مختلف نوعیتوں سے تقسیم کی گئی ہے اس میں مسلسلات بھی شامل ہیں امام حاکم نے معرفت علوم الحدیث میں مسلسلات کو متن حدیث کی دسویں قسم میں شمار کیا ہے، (۳۳) حضرت شاہ صاحب نے مسلسلات کی اپنی اکثر مرویات کو اپنے تین رسائل میں جمع فرمادی ہیں جو یہ ہیں:

(۱) الفضل المبین (۲) الدر الثمین (۳) النوادر

ان تینوں مجموعوں کو مسلسلات کہا جاتا ہے، الفضل المبین میں (اور یہی اصل مسلسلات ہے) کل ۵۰ مسلسلات ہیں جس میں پچیس شیخ ابو طاہر کی سند و اجازت سے ہیں، باقی دوسرے علماء یا اساتذہ سے اخذ کی گئی ہیں۔

ان مسلسلات میں ”المسلسل بقراۃ سورۃ الصف“ مسلسلات کی دنیا میں صحیح ترین روایت ہے، اس کی صحت پر علماء کا تقریباً اتفاق ہے، علامہ عراقی فرماتے ہیں: اصح مسلسل یروی فی

الدنیا مسلسل بقرأۃ سورۃ الصف“ (ظفر الامانی: ۲۵۸) ”افضل“ کی روایات عام طور پر قلیلۃ المبنی کثیرۃ المعنی ہیں اور بقول ندوی: ”رسالہ اس قابل ہے کہ زبانی یاد کیا جائے اور نصاب میں داخل کیا جائے۔“ (تاریخ دعوت ص ۱۹۳)

”الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین“ ...... یہ ان چالیس روایات پر مشتمل ہے جن کا مصدر شاہ صاحب اور ان کے اساتذہ کا رؤیائے صادقہ ہے، یہ رسالہ مع اردو ترجمہ کے جو ظہیر الدین احمد نے کیا تھا، ۱۸۹۰ء میں دہلی میں شائع ہوا تھا، اس کی حدیثوں کو شاہ صاحب نے تین حصوں میں منقسم کیا ہے، ایک وہ جنہیں خود شاہ صاحب نے آنحضرت صلی اللہ سے سنا، دوسری وہ حدیثیں جو انہوں نے ایک واسطے سے سنیں، تیسری وہ حدیثیں جو شاہ صاحب کو ایک سے زیادہ واسطے سے پہنچیں۔ (معارف دسمبر ۱۹۴۳ء ص ۲۶)

”النوادر من احادیث الاوائل والاواخر“ ...... یہ ان چالیس روایات کا مجموعہ ہے جنہیں شاہ صاحب نے جنوں یا خضر کے سند سے حاصل کیا ہے۔

ان دونوں کتابوں کو ”النوادر“ بھی کہہ دیا جاتا ہے، اگرچہ یہ دونوں رسالے مسلسلات کے فن کے نہیں ہیں لیکن ان دونوں رسالوں میں مسلسلات کی بعض احادیث درج ہیں، جیسے: مسلسل بالمشابکہ (پنجہ کشی کی روایت) یہ نوادر میں مذکور ہے (اتحاف النبیہ ص ۲۲۳) مسلسل بالمشابکہ کی روایات کو امام حاکم اور علامہ عراقی وغیرہ نے واضح طور پر مسلسلات میں ذکر فرمایا ہے، (معرفۃ علوم الحدیث ص ۳۳، الاتحاف) اسی طرح متاول بالسجد والی روایت بھی جو نوادر میں ہے مسلسل حدیث ہے، علامہ شیخ محمد عابد نے حصر الشارد میں اس کو نقل کیا ہے۔

نوادر حجت نہیں، ان کا ذکر برائے استئناس جائز ہے، شاہ صاحب لکھتے ہیں: ”ولا تقوم بمثل هذه الاحاديث الحجة وانما يستأنس بها“ (۲۱۸)

مسلسلات عموماً تسلسل کے بیان میں ضعف کی حامل ہیں (مقدمہ ابن الصلاح ص ۲۷۷) لہٰذا ان احادیث کی فنی تحقیق ضروری ہے ان مستقل رسالوں کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے اصول حدیث کے بعض مباحث پر اتحاف اور حجۃ اللہ البالغۃ میں بھی گفتگو کی ہے۔

”اتحاف النبیہ“ میں محدث اور وراق کی تعریف، دونوں میں فرق، محدثین کی معرفت کے ذرائع کے ساتھ ساتھ آپ نے عصر حاضر میں کتب احادیث کے مؤلفین تک متصل سندوں کے طرق پر بھی گفتگو کی ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں اصول حدیث کے مباحث

حجۃ میں آپ نے جا بجا اصول حدیث کے متعدد مباحث پر نفیس گفتگو کی ہے، جن کا خلاصہ ہدیۂ قارئین کیا جارہا ہے۔

(۱) حدیث کی تقسیم اور ضعیف حدیث کا حکم

حجۃ کے ”باب کیفیۃ تلقی الامۃ الشرع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ میں شاہ صاحب لکھتے ہیں: شریعت کا ایک ماخذ نقل ظاہری ہے جس کے دو درجے ہیں، ایک متواتر اللفظی ہو جیسے قرآن کریم اور معدودے چند احادیث یا تواتر معنوی ہو جیسے: طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، تجارتی معاملات، نکاح اور غزوات کے وہ بیشتر احکام جن پر امت کا اتفاق ہے اور دوسرا درجہ غیر متواتر جس کی اعلیٰ قسم مستفیض ہے اور اسی قسم پر بڑے بڑے فقہی مسائل کی بنیاد ہے، پھر صحیح، حسن اور اس کے بعد مختلف روایات ہیں۔

ضعیف حدیث کے متعلق شاہ صاحب کا موقف یہ تھا کہ اس سے اجتناب کیا جائے اور حجۃ میں اس پہلو سے آپ نے بھرپور توجہ دی ہے، چنانچہ غزالی کی احیاء علوم الدین پر حجۃ کو اس اعتبار سے بھی فوقیت حاصل ہے کہ اس میں مذکور اکثر احادیث صحاح ستہ کی ہیں جب کہ اول الذکر کی اکثر روایات ضعیف اور موضوع ہیں۔

کتاب الفتن میں عموماً محدثین نے ضعیف احادیث یکجا کردی ہیں لیکن حجۃ کا کتاب الفتن پڑھ ڈالئے، آپ دیکھیں گے کہ شاہ صاحب نے صحیح ترین احادیث کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، پوری حجۃ میں آپ نے عموماً صحاح ستہ کی روایات پر اعتماد کیا ہے الا ماندر۔

(۲) حدیث مرفوع کا ایک مسئلہ:

محدثین کے نزدیک صحابی کا یہ قول ”كنا نفعل كذا فی العهد النبوی امرنا بكذا او نهينا عن كذا“ مرفوع کے حکم میں ہوگا۔ (دیکھیے مقدمہ ابن الصلاح ص ۶۸) شاہ صاحب علماء اصول حدیث کے اس اصول سے بھرپور اتفاق کرتے ہوئے کہتے ہیں:

صحابہ کرام کے یہ اقوال کہ (امر) (نہی) قضیٰ، رخص، امرنا، نهينا، من السنة كذا (سنت اس طرح ہے) وعصیٰ ابا القاسم من فعل كذا (جس نے ایسا کیا اس نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی)، هذا حكم النبی صلی اللہ علیہ وسلم (یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے) مرفوع کے حکم میں ہوں گے۔

(۳) مختلف و متعارض حدیثوں کا مسئلہ

یہ فن علوم حدیث کا اہم ترین فن ہے، جملہ علماء اس فن کی معرفت کے محتاج ہیں، اس فن پر فنی اور علمی گفتگو وہی کر سکتا ہے جو حدیث و فقہ و اصول کا ماہر ہو اور دقیق معانی کے استخراج پر اسے ید طولیٰ حاصل ہو، شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کے لیے ایک باب "باب القضاء فی الاحادیث المختلفۃ" کے نام سے قائم فرمایا ہے اور تعارض کو دفع کرنے کے لیے کافی نفیس و فنی گفتگو فرمائی ہے اور آغاز میں دو اصولی باتیں بیان کی ہیں:

پہلا اصول: تمام حدیثوں پر عمل کیا جائے گا، الا آنکہ تناقض کی وجہ سے ناممکن ہو؛

دوسرا اصول: یہ ہے کہ احادیث میں فی الحقیقت اختلاف نہیں ہے، اختلاف کا تعلق ہماری نظروں سے ہے۔

دو مختلف احادیث میں عمل کے تعلق سے آپ نے چار درجے قائم فرمائے ہیں:

۱۔ جمع و تطبیق

اگر دو حدیثیں مختلف و باہم متعارض ہوں اور دونوں فعلی حدیث ہوں اور دونوں افعال از قبیل عادت ہوں تو دونوں مباح قرار پائیں گے اور ایک عبادت کے قبیل کا اور دوسرا فعل از قبیل عادت تو اول الذکر مستحب اور مؤخر الذکر مباح قرار پائیں گے اور کسی ایک کی ادائیگی کافی ہوگی، بیشتر متعارض فعلی سنتوں میں صحابہ کرامؓ نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے، اور کبھی کبھی دو مختلف حدیثیں کسی ایک تنگی سے نکلنے کی دو راہیں ہوتی ہیں، جیسے کفارہ کی مختلف صورتیں اور محارب کی سزائیں، یا دو مختلف حدیثوں میں کبھی کوئی ایسی مخفی علت ہوتی ہے جو ایک کام کو ایک وقت میں واجب یا مستحسن اور دوسرے کو دوسرے وقت میں واجب یا مستحسن قرار دیتی ہے یا کسی وقت میں ایک اہم کام کو واجب کرنے والی اور دوسرے وقت اسے چھوڑ دینے کی رخصت دینے والی ہو، ایسی صورت میں علت کا پتہ لگانا ضروری ہے۔

۲۔ تاویل

اگر متعارض حدیثوں میں سے ایک قولی تحریم یا وجوب پر اس کی دلالت غیر قطعی ہو اور دوسری فعلی ہو تو اس میں مختلف صورتوں کا احتمال ہوگا لیکن اگر قولی قطعی الدلالت ہوگی تو فعل کو نبیؐ کے ساتھ مخصوص سمجھا جائے گا اور اگر دونوں حدیثیں قولی ہوں لیکن ایک معنی میں ظاہر اور دوسری مؤول ہو اور تاویل زیادہ بعید نہ ہو تو ایک حدیث کو دوسری حدیث کے بیان پر محمول کیا جائے گا اور اگر تاویل

بعید ہو تو ایسی تاویل پر اسی وقت محمول کیا جائے گا جب کوئی قرینہ موجود ہو یا کسی فقیہ صحابی سے تاویل منقول ہو، اگر دونوں حدیثیں کسی مسئلہ میں فتویٰ یا کسی واقعہ میں قضاء سے متعلق ہوں اور دونوں میں فرق کی علت ظاہر ہو جائے تو اس کے مطابق عمل کیا جائے گا، جیسے روزہ کی حالت میں نوجوان کو بوسہ لینے سے آپؐ نے منع کر دیا اور بوڑھے کو اجازت دے دی۔

۳۔ نسخ: اگر نسخ کی دلیل ظاہر ہو جائے تو نسخ پر عمل کیا جائے گا۔

۴۔ ترجیح: اگر تطبیق، تاویل کی گنجائش نہ ہو اور نسخ کا علم نہ ہو تو دونوں حدیثوں میں تعارض طے پائے گا اور کسی وجہ ترجیح کی بناء پر ایک کو راجح قرار دیا جائیگا:

(الف) رواۃ کی کثرت، یا راوی کی فقہ کا لحاظ یا سند کے اتصال کی قوت یا صیغہ مرفوع کی صراحت کا خیال یا راوی کے صاحب معاملہ ہونے کو بنیاد بنایا جائے گا، جیسے وہ مستفتی ہو یا واقعہ اس کے ساتھ پیش آیا ہو یا اس کو مخاطب کر کے وہ بات کہی گئی ہو۔

(ب) متن میں ترجیح کا پہلو جیسے روایت میں تاکید و تصریح کا ہونا۔

(ج) یا حکم و علت کے لحاظ سے ترجیح ظاہر ہو مثلاً وہ احکام شریعت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہو یا حکم کی علت سے موزوں و مناسب اور اس کی تاثیر معروف ہو۔

(د) یا ترجیح کا کوئی خارجی پہلو موجود ہو، جیسے ایک کو اکثر اہل علم نے اختیار کیا ہو، اگر ترجیح کی یہ آخری صورت بھی ممکن نہ ہو تو پھر دونوں حدیثیں ناقابل عمل قرار پائیں گی لیکن بقول شاہ صاحب یہ صورت محض مفروضہ ہے۔

ان اصولوں کی روشنی میں اگر متعارض و مشکل احادیث پر غور کیا جائے تو کوئی اشتباہ و اشکال باقی نہ رہے گا۔

مرسل حدیث سے احتجاج

مرسل حدیث کی حجت کے باب میں تین رائیں ہیں: (۱) جمہور محدثین کے نزدیک مردود ہوگی اتصال سند کے فقدان کی بناء پر۔ (۲) امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مطلقاً حجت ہوگی۔ (۳) امام شافعیؒ کے نزدیک مرسل حدیث چند شرطوں کے ساتھ حجت ہوگی اور شاہ صاحب نے اسی تیسری رائے کو ترجیح دیا ہے، وہ لکھتے ہیں "مرسل حدیث سے استدلال اس وقت درست ہوگا جب اس کی تائید کسی صحابی کے قول یا کسی مسند ضعیف حدیث یا کسی اور مرسل روایت سے ہو رہی ہو، یا اکثر اہل علم نے اس کے مطابق فتویٰ دیا ہو یا کسی صحیح قیاس سے اس کی تائید ہو رہی ہو یا اس کے مفہوم

کی جانب کسی نص سے اشارہ مل رہا ہو یا عرف اس کی تائید کر رہا ہو یا ارسال کرنے والا صرف عادل راویوں ہی سے روایت کا خوگر ہو۔ (حجۃ اللہ البالغہ: ۱/۳۰۳)

ثقہ راوی کا اضافہ

جمہور محدثین کی طرح شاہ صاحب بھی اس اضافہ کو مقبول و معتبر مانتے ہیں جو دوسری روایات سے متعارض نہ ہو، جیسے مرسل حدیث کو موصولاً بیان کرنا، حدیث کا سبب اور اس کے ورود کی جگہ بیان کرنا یا کسی مستقل جملہ کی روایت جس سے کلام میں تبدیلی واقع نہ ہو اور اگر تبدیلی واقع ہو یا ایسا اضافہ ہو جس کو عادتاً چھوڑا نہ جا سکتا ہو تو غیر مقبول ہوگا۔ (دیکھیے حجۃ اللہ جلد ا، ص ۳۰۳، مقدمہ ۱۱۱ و ۱۱۲)

الحکم علی الاحادیث

(کتب احادیث کی درجہ بندی)..... حدیثوں پر حکم لگانا، اصول حدیث، فن جرح و تعدیل کا منتہی و مقصود ہے، ان علوم کے بغیر صحیح و ضعیف احادیث کے درمیان تمیز ممکن نہیں، حدیث چونکہ شریعت کا مصدر ثانی ہے، اس لیے صحیح و ضعیف کی تمیز اس مصدر کے اعتبار و وثوق اور اس پر اعتماد کے لیے ضروری ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اگرچہ فنی لحاظ سے ائمہ ستہ اور ابن حجرؒ، سخاویؒ اور دیگر ائمہ جرح و تعدیل کی طرح ہر ہر حدیث پر حکم نہیں لگایا ہے لیکن آپ نے حجۃ اللہ البالغہ اور اتحاف النبیہ میں احادیث کے مجموعوں پر مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ نظر ڈالی اور اسناد کے معیار پر کھل کر بحث کی اور کتب حدیث کی درجہ بندی فرمائی، آپ سے پہلے کسی بھی متقدم نے اس پہلو سے گفتگو نہیں کی ہے۔

آپ نے کتب احادیث کے چار طبقات قائم فرمائے ہیں اور پانچویں درجہ پر فقہاء اور صوفیاء کے درمیان مشہور روایات کو رکھا ہے۔

آپ نے اس درجہ بندی میں دو اصول کو مد نظر رکھا ہے:

پہلا اصول: کتاب کے مؤلف نے یہ شرط لگائی ہو کہ وہ اپنی کتاب میں صحیح یا حسن حدیث ہی درج کرے گا اور ضعیف حدیث، اس کی کیفیت و حالت بیان کیے بغیر ذکر نہیں کرے گا۔

دوسرا اصول: وہ احادیث مشہور ہوں، تدوین سے پہلے اور بعد بھی ہر زمانے میں محدثین نے اس کی روایت اور اس کے طرق کی تخریج اور اس کے غریب کی شرح کی ہو اور مجتہدین نے ان کو اپنا مستدل بنایا ہو اور ناقدین نے ان احادیث کی تصحیح کی ہو اور کتاب کی مدح و ستائش کی ہو۔

حدیث کی جس کتاب میں دونوں شرطیں بدرجہ اتم موجود ہوں گی وہ کتاب طبقہ اولیٰ میں شمار ہوگی اور ان میں کمی کے لحاظ سے فروتر طبقات میں شمار ہوگی اور اگر کسی کتاب میں سرے سے یہ

اوصاف مفقود ہوں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

طبقہ اولیٰ: اس میں شاہ صاحب نے صرف تین کتابوں کو رکھا ہے، موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم۔

اس طبقہ کی کتابوں میں مذکور روایات نہ صرف نقاد حدیث کے نزدیک صحیح ہیں بلکہ ان کتب حدیث پر ہر پہلو سے بہت کچھ کام کیا گیا ہے نیز ان کو روایت کرنے والے بھی بے شمار رہے ہیں، مجموعی طور پر امت نے صحیحین کی روایات کو قبول کیا ہے۔

شاہ صاحب نے موطا کی روایات کو صحیحین پر ترجیح دی ہے، چنانچہ آپ وصیت نامے میں لکھتے ہیں: "جب عربی زبان کی قدرت ہو جائے موطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ المصمودی پڑھا دیں، اسے ہرگز نہ چھوڑیں کہ علم حدیث کی اصل ہے اور اس کے پڑھنے میں بہت فیض ہے۔

شاہ صاحب نے موطا کو بخاری پر ترجیح درج ذیل اسباب کی بنا پر دیا ہے:

۱۔ موطا کی سندیں عالی ہیں، موطا میں چالیس ثنائیات ہیں، بخاری میں ایک بھی نہیں، نیز موطا میں ثلاثیات کی کثرت ہے، بخاری میں صرف تین ہیں۔

۲۔ موطا میں سلسلۃ الذہب مالک عن نافع عن ابن عمر کے واسطہ سے کثرت سے روایات مروی ہیں جس کی کل تعداد ۱۹۰ کے لگ بھگ ہیں۔

۳۔ بقول مولانا عبید اللہ سندھی: "موطا میں وہ تمام مشکل حدیثیں نہیں پائی جاتیں جن کا سمجھنا کالجوں کے طلباء کے لیے مشکل ہے" (رود کوثر: ۵۵۷، الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر: ۲۸۷)

۴۔ متعدد فقہاء جیسے شافعیؒ، امام محمدؒ، امام احمدؒ نے موطا کو اپنا مستدل بنایا ہے اور صحاح ستہ کے مؤلفین نے اس کی احادیث کی اپنی کتابوں میں تخریج کی ہے۔

اسی لیے امام شافعیؒ نے فرمایا: "روئے زمین پر کتاب الٰہی کے بعد موطا مالک سے صحیح ترین کوئی کتاب نہیں"

جمہور محدثین نے صحیحین کو موطا پر ترجیح اس لیے دی ہے کہ صحیحین مجرد صحیح احادیث پر مشتمل ہیں جبکہ موطا میں بلاغات، مراسیل اور آثار صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ بھی کثرت سے منقول ہیں، ورنہ متصل احادیث کا رتبہ مجموعی لحاظ سے صحیح بخاری کی احادیث سے بلند تر ہے اور صحیح احادیث کی تدوین کا امام مالک کو بقول مغلطائی شرف بھی حاصل ہے۔

طبقہ اولیٰ کی جملہ روایات ایک درجہ کی نہیں ہیں بعض روایات دوسری روایات سے صحیح تر

اور مشہور تر ہیں۔

دوسرا طبقہ: دوسرے درجہ میں وہ کتب احادیث آتی ہیں جن کی احادیث پہلے طبقہ کی احادیث کے ہم پلہ تو نہیں ہیں لیکن ان سے کچھ فروتر ہیں، ان کے مؤلفین، وثوق، عدالت، حفظ، اتقان اور فنون حدیث میں عبور رکھنے میں مشہور و معروف تھے اور انہوں نے اپنی کتابوں میں تساہل نہیں برتی ہے اور حتی الامکان احادیث کی حالت وکیفیت اور ان کی علتوں کا ذکر کر دیا ہے۔

اس طبقہ میں جامع الترمذی، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کو شاہ صاحب نے رکھا ہے، مسند الامام احمد کو بھی اسی طبقہ میں شمار کیا ہے، چنانچہ سنن الترمذی میں کوئی موضوع حدیث اور ابوداؤد میں کوئی غیر معمول بہ حدیث اور نسائی میں کوئی ایسی حدیث درج نہیں ہے جس کے متروک ہونے پر امت کا اتفاق ہو اور مسند احمد با سند کی احادیث کی معرفت کا اہم ترین ذریعہ ہے اس میں بعض ضعیف حدیثیں ہیں لیکن وہ بھی متاخرین کی تصحیح کردہ احادیث سے فنی لحاظ سے عمدہ اور بہتر ہیں۔

سنن ابن ماجہ بھی اس طبقہ کی آخری کتاب ہے کیونکہ اس میں بعض احادیث بے حد ضعیف ہیں۔

تیسرا طبقہ: اس طبقہ میں وہ کتب مسانید اور جوامع آتی ہیں جو شیخین سے پہلے یا بعد میں لکھی گئیں، ان کے مؤلفین تو معتبر اور ثقہ تھے لیکن ان کا مقصد بلاتمیز وتہذیب سنن واحادیث کو یکجا کر دینا تھا، یہ کتابیں صحیح، حسن، ضعیف، غریب، منکر اور شاذ، خطا اور صواب، ثابت اور مقلوب سب پر مشتمل ہیں، جیسے: مسند الامام الشافعی، مسند الدارمی، مسند ابی یعلیٰ، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید، مسند الطیالسی، سنن الدارقطنی، صحیح ابن حبان، مستدرک الحاکم، بیہقی، طحاوی اور طبرانی کی کتابیں، لہٰذا ان کتابوں پر بحث وتمحیص کے بغیر اعتماد اور اس کی احادیث سے مسائل کا استخراج درست نہیں، اس طبقہ کی حدیثوں سے استخراج، ماہرین فن اور ائمہ جرح وتعدیل ہی کر سکتے ہیں۔

طبقہ رابعہ: اس طبقہ میں وہ کتابیں آتی ہیں جن کے مؤلفین نے کئی صدیوں کے بعد ان روایتوں کو جمع کیا جن کا اتا پتا بھی طبقہ اولیٰ و ثانیہ میں نہیں پایا جاتا، سلف نے ان روایات کا کوئی نشان بھی نہیں پایا تھا یا پایا تھا لیکن وہ قادح علتوں پر مشتمل تھیں، جن کی بنا پر انہیں سلف نے نظر انداز کر دیا تھا جیسے: الضعفاء لابن حبان، الضعفاء العقیلی، الکامل لابن عدی، ابن مردویہ کی کتابیں خطیب، ابن شاہین اور جوزقانی کی کتابیں، ابونعیم کی حلیہ ابن عساکر کی تاریخ دمشق، ابن النجار کی ذیل تاریخ بغداد، دیلمی کی الفردوس، مسند الامام ابی حنیفہ للخوارزمی، ابوالشیخ الاصبہانی کی کتابیں ہیں، اس طبقہ کی

کتابوں میں عمدہ ترین احادیث ضعیف اور زیادہ بدتر وہ ہیں جو موضوع و منکر ہیں، ابن الجوزی کی الموضوعات کا ماخذ اسی طبقہ کی کتابیں ہیں، اس طبقہ کی احادیث سے اشتغال واستنباط محدثین کا طریقہ نہیں بلکہ متاخرین کا تعمق ہے۔

طبقہ خامسہ: اس طبقہ میں شاہ صاحب نے ان احادیث کو رکھا ہے جو فقہاء، صوفیاء، مؤرخین وغیرہ کے یہاں مشہور ہیں جن کی کوئی اصل مذکورہ بالا طبقات کی کتابوں میں نہیں ہے، یہ پھر ایسی روایات ہیں جنہیں دشمنان دین نے اسلام کی شبیہ کو بگاڑنے کے لیے وضع کر دیا ہے۔

روافض، معتزلہ وغیرہ ان احادیث سے استنباط و استدلال کرتے ہیں لیکن علماء حدیث اور اہل سنت کے لیے علمی بحثوں میں بطور تائید انہیں پیش کرنا قطعاً جائز نہیں۔

تاریخ تدوین حدیث وعلوم حدیث

اس موضوع پر شاہ صاحب نے کوئی مستقل رسالہ نہیں لکھا ہے، فقہاء کے اختلاف کے اسباب وعلل کے بیان پر مشتمل آپ کا رسالہ "الانصاف" کو صاحب رود کوثر کے بقول "تاریخ فقہ وعلم الحدیث" کہا جائے تو بجا ہے کیونکہ فی الحقیقت یہ کتاب عہد سعادت سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک فقہ وحدیث کی تدوین، کتب احادیث کی فراہمی اور مختلف مذاہب فقہی کے آغاز کی ایک نہایت دلچسپ منصفانہ اور پر از معلومات تاریخ ہے، آپ نے الانصاف میں انتہائی اختصار کے ساتھ جمع احادیث اور محدثین مثلاً بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی کے مجموعوں کی خصوصیات بیان کی ہیں اور اتحاف النبیہ میں عہد نبوی سے لے کر جمع احادیث کے مرحلے تک حاملین حدیث اور ان کے طرق کا تفصیلی شجرہ بیان کیا ہے، اس شجرہ سے واقفیت، صحیحین، ابوداؤد اور ترمذی کے درس میں کافی معاون و مددگار ہوگا۔ (الانصاف)

فن ناسخ الحدیث ومنسوخہ

نسخ کے لغوی معنی زائل کرنا، مٹانا اور نقل کرنے کے آتے ہیں، اصطلاح میں شارع کا اپنے سابق حکم کو کسی نئے حکم سے بدل دینا نسخ کہلاتا ہے۔ (تیسیر المصطلح: ۵۹)

یہ فن کافی اہم اور مشکل فن ہے کیونکہ اس کے بغیر مختلف ومتعارض حدیثوں میں شارع کے مقصود وحکم کی معرفت مشکل ہے، شاہ صاحب نے اس موضوع پر کوئی مستقل رسالہ تو نہیں لکھا ہے لیکن حجت کے "باب القضاء فی الاحادیث المختلفۃ" کے تحت نسخ کی تعریف، اس کی مثال اور اسرار وحکم کے ساتھ ساتھ اس کی معرفت کے اہم ذرائع پر بھی انتہائی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، شاہ

صاحب کے نزدیک اس کی معرفت کے ذرائع درج ذیل ہیں:

(۱) نص نبوی: جیسے آپ صلی اللہ کا یہ ارشاد: "کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور الا فزوروھا" (مسلم)

(۲) تاریخ کے ذریعہ: یعنی جب یہ معلوم ہو کہ فلاں حکم فلاں سے متاخر ہے تو متقدم منسوخ ہوگا بشرطیکہ جمع و تطبیق کا امکان نہ ہو، جیسے "روزہ کی حالت میں سینگی لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ختم ہو گیا" یہ حدیث آپ نے فتح مکہ کے موقع پر ارشاد فرمائی تھی جب کہ ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر بحالت احرام اور روزہ میں سینگی لگوائی تھی۔

(۳) کوئی صحابی متعارض حدیثوں کے درمیان ناسخ و منسوخ ہونے کا فیصلہ کرے، البتہ یہ ذریعہ قطعی نہیں۔

بعض فقہاء کا کسی حدیث پر اپنے مشائخ کے عمل کو نہ پاکر اس حدیث کے منسوخ ہونے کا فیصلہ کرنا درست اور اطمینان بخش نہیں ہے۔

نسخ کی علت پر گفتگو کرتے ہوئے شاہ صاحب رقمطراز ہیں کہ: نسخ اگر چہ ایک حکم کا دوسرے حکم سے بدل جانے کا نام ہے لیکن حقیقت میں حکم متقدم کی علت کے ختم ہونے یا مقصد اصلی کے مظہر ہونے کے خاتمہ یا کسی مانع علت کے موجود یا وحی جلی یا اجتہاد نبوی کے ذریعہ کسی حکم کو متقدم حکم پر ترجیح دینے کا نام نسخ ہے بشرطیکہ حکم متقدم اجتہادی ہو۔ (حجۃ اللہ البالغہ: ۱/۱۰۲)

فقه الحديث

فقہ الحدیث سے مراد ان شرعی و عملی احکام کی معرفت ہے جو براہ راست احادیث نبویہ سے ثابت ہوں، احکام شرعیہ کو براہ راست قرآن و سنت سے اخذ کرنا عقل و دل کو لگتا ہوا طریقہ ہے، کیونکہ مسائل کو کتاب و سنت کے دلائل سے جڑا ہوا دیکھ کر قاری کے دل میں ان مسائل پر عمل کرتے وقت اللہ اور اس کے رسول سے براہ راست جڑنے کا احساس ہوتا ہے نیز اس طریقے سے شریعت مصطفویہ کی صحیح صورت سامنے آتی ہے، اختلافات کا خاتمہ ہوتا ہے، مذاہب کے لیے تعصب کی بدعت کا ازالہ ہوتا ہے "باب الاجتهاد قد سُدّ" جیسی خرافات چھٹ جاتی ہیں، اسی سے شاہ صاحب نے اس پر بھرپور توجہ دی، اتحاف النبلاء میں ہے "بعد دراسة كتب المذاهب الاربعة و كتب اصول الافقه والاحاديث التي يتمسك بها يميل القلب بتاييد من الله وهدايته الى الفقهاء المحدثين" (ص ۴۲۹) (انفاس العارفين ص ۲۰۴)

مذاہب اربعہ اور ان کے اصول فقہ کی کتابوں کے مطالعہ اور جن احادیث سے وہ استدلال کرتے ہیں ان پر غور کرنے کے بعد طبیعت میں فقہائے محدثین کی روش قرار پذیر ہوئی، اس میں نور غیبی کی تائید شامل ہوئی اور اس سلسلے میں آپ نے دو نمایاں کارناموں کو انجام دیا:

۱۔ فقہ السنۃ کے اصول و ضوابط کو تحریر فرمایا، جس کا ماخذ صحابہ و تابعین کا نصوص کے تئیں تعامل کا طریقہ اور اس باب میں مروی سلف کے آثار ہیں (الانصاف)

۲۔ کتب احادیث کی اصل و بنیاد موطا کی عربی و فارسی میں شرحیں لکھیں، نیز حجۃ اللہ البالغۃ میں بھی جا بجا آپ نے فقہ احادیث پر گفتگو فرمائی ہے، شاہ صاحب کے نزدیک محدثین کے فقہ الحدیث کے اصول درج ذیل ہیں:

(۱) جب مسئلہ میں کوئی صریح الدلالۃ آیت موجود ہو تو کسی دوسرے مصدر کی جانب رجوع جائز نہیں۔

(۲) جب قرآنی آیت متعدد تاویلات کی حامل ہو تو اس کے راجح مفہوم کی تعیین سنت نبوی کرے گی۔

(۳) جب کتاب الٰہی میں وہ مسئلہ نہ ہو تو سنت نبوی کی طرف رجوع کیا جائے گا خواہ وہ حدیث مشہور ہو یا کسی شہر اور جتھہ میں محصور ہو، صحابہ اور فقہاء نے اس پر عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

(۴) نص حدیث کے مقابلہ میں کسی اثر یا اجتہاد کی پیروی نہیں کی جائے گی۔

(۵) مسئلہ میں اگر کوئی حدیث نہ ہو تو صحابہ اور تابعین کے اقوال کو لیا جائے گا، کسی خاص صحابی یا تابعی کی تقلید و تقیید کے بغیر۔

(۶) اگر جمہور خلفاء و فقہاء کسی مسئلہ پر متفق ہوں تو وہ چیز قابل اتباع ہوگی۔

(۷) اگر وہ مختلف الرائی ہوں تو ان میں علم و پرہیزگاری اور ضبط میں جو سب سے نمایاں ہو اس کی حدیث لی جائے گی یا جو حدیث ان میں سے مشہور ہو۔

(۸) اگر کسی مسئلہ میں ان کی رائیں برابر ہوں تو یہ مسئلہ دو قولوں والا ہوگا۔

(۹) اگر مذکورہ بالا چیزوں میں سے کوئی چیز نہ ہو تو کتاب و سنت کے عموم اور ان کے اشارات و مقتضیات پر غور کیا جائے گا اور مسئلہ کی نظیر تلاش کی جائے گی اور اس سلسلے میں متعین اصولوں کی پابندی نہیں کی جائے گی بلکہ جس پر شرح صدر اور دل کو یقین نصیب ہو اس پر عمل کیا جائے گا (الانصاف: ص ۵۰)

فقہ الحدیث کے ان اصولوں کو من وعن جناب محمد اسمٰعیل سلفی گوجرانوالہ نے اپنی کتاب "تحریک آزادی فکر اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی" میں نقل کیا ہے۔ (ص ۸۷)

فقہاء محدثین کی طرح شاہ صاحب بھی اس رائے کو اختیار کرتے جس کی پشت پر صحیح حدیث ہوتی اور اگر کسی نزاعی مسئلہ میں دونوں فریق کے پاس دلائل واحادیث ہوتیں تو دونوں کے جواز کا فتویٰ دیتے، چند مسائل میں آپ کے طریقہ اختیار کو ملاحظہ فرمائیں:

قرأۃ خلف الامام: شوافع اور حنفیہ کے درمیان مشہور نزاعی مسئلہ ہے، شاہ صاحب کہتے ہیں مقتدی پر جہری قرأت میں استماع وانصات واجب ہوگا لہٰذا جب امام دو آیتوں کے درمیان آئے تو اس دوران پڑھ لے اور سری نماز میں اس کو پڑھنے اور نہ پڑھنے کا اختیار ہے، البتہ اس طرح پڑھے کہ امام کی نماز میں خلل نہ واقع ہو، یہ رائے جملہ احادیث وآثار کی جامع ہے۔ (حجۃ اللہ ۹/۲)

نواقض وضو: آپ کے نزدیک اصل ناقض وضو خارج من السبیلین ہے بقیہ اشیاء کو اسی پر محمول کیا جائے گا۔ (حجۃ اللہ ۱/۱۷۴)

جمع بین الصلوتین: جائز ہے البتہ قصر کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مواظبت اختیار نہیں کی ہے۔ (حجۃ اللہ ۲/۱۱)

قنوت: حنفیہ کے نزدیک اس کا محل وتر کی نماز اور شوافع کے نزدیک صبح کی نماز ہے، شاہ صاحب کے نزدیک صبح میں پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں برابر ہے، البتہ کسی حادثہ کے علاوہ عام حالات میں نہ پڑھنا افضل ہے۔ (حجۃ اللہ ۲/۲۴)

غریب الحدیث: غرائب حدیث پر شاہ صاحب نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی ہے لیکن المسوی، المصفی اور شرح تراجم ابواب البخاری میں جابجا آپ نے جو حل لغات کیا ہے اس کو یکجا کر دیا جائے تو صحاح ستہ کی بنیادی احادیث کو سمجھنے کے لیے یہ لغت کافی ہوگی، چند نمونے ملاحظہ ہوں:

۱. الضغث: معالجة شعر الرأس باليد ليصل الماء المسوى (ج ۱، ص ۹۱)

۲. لا تشفوا: أى لا تفضلوا والشف من الاضداد يجيئ بمعنى الزيادة والنقصان. (المصفى)

۳. من وراء البحار: اى من وراء البلاد والبحر البلد. شرح تراجم (ص ۹۰)

تطبیق بین الفقہ والحدیث: جس طرح حدیث کتاب اللہ کی شرح ہے اسی طرح

فقہاء کے اجتہادات درحقیقت احادیث رسول اللہ کی شرح وتفصیل ہیں۔ (الخیر الکثیر ص ۸۷)

شاہ صاحب سے پہلے ہند اور بلاد ماوراء النہر میں فقہ حنفی کا غلبہ تھا اور فقہاء کی ساری دلچسپیاں صرف فقہ ومعقولات سے تھیں، فقہی مسائل بیان کرتے وقت کسی قدیم فقیہ کے قول کا حوالہ تو دیا جاتا لیکن اس حدیث کا حوالہ نہیں دیا جاتا تھا جس سے وہ مسئلہ ماخوذ تھا، اس طرح فقہ کا رشتہ حدیث سے کٹ گیا تھا اور فقہ وحدیث کے دو متوازی سلسلے بن گئے تھے اور فقہی تعصب کا بول بالا تھا اور ہر مذہب کے پیرو اپنے مذہب کو سو فیصد صحیح کہتے تھے، بشریت کی بنا پر اگرچہ غلطی کا احتمال مانتے تھے، کسی نے اس طرز فکر کو بڑے بلیغ انداز میں اس جملے سے ادا کیا ہے: "مذهبنا صواب يحتمل الخطأ ومذهب غيرنا خطأ يحتمل الصواب" اس کی وجہ سے حنفی، شافعی گروہی عصبیتوں کا بازار گرم تھا اور ہر ایک دوسرے کی تردید وتغلیط میں مبتلا تھا، آپ نے غالی فقہاء اور الظاہریہ الجدد (جو مطلقاً فقہ کا منکر اور ان کی شان میں لب کشائی کرتا ہے جو حاملین علم کے سرتاج اور اہل دین کے امام وپیشوا ہیں) کی روش پر سخت تنقید کی اور دونوں کے غلو وانتہا پسندی کو ناپسند فرمایا اور صاف صاف لکھا کہ "ان الحق امر بين بين" "معاملہ بین بین ہے، نہ پہلا فریق سو فیصدی حق پر ہے نہ دوسرا فریق، حجۃ اللہ میں آپ لکھتے ہیں:

"ایک طرف کلام فقہاء پر تخریج، دوسری طرف احادیث کے الفاظ کا تتبع دونوں کی دین میں مستحکم اصل موجود ہے اور ہر زمانے کے علمائے محققین ان دونوں اصولوں پر عمل کرتے رہے ہیں، بعض ایسے ہیں جن کا تخریج کے بارے میں قدم پیچھے اور حدیث کے الفاظ کے تتبع میں قدم آگے ہے اور بعض اس کے برعکس، ان میں سے کسی ایک اصول سے بھی مطلقاً صرف نظر مناسب نہیں ہے، جیسا کہ فریقین کے عوام کا شیوہ ہے، اس بارے میں صراط مستقیم یہی ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی جائے اور ایک کی کمی دوسرے سے پوری کی جائے اور یہی امام حسن بصری کا قول ہے۔ (ج ۱ ص ۱۵۹)

نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنا یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ اجتہادی مسائل کو قرآن وسنت پر پیش کرتے ہیں اور مسائل فقہیہ کے ہر باب کو قرآن وحدیث پر تطبیق دیتے ہیں..... اور ان کا یہ تمام طریقہ مذہب حنفی ہے" (الحطہ بذکر الصحاح الستہ ص ۷۱)

شاہ صاحب حنفیہ کے اس قول کو ترجیح دیتے تھے جو انہیں کتاب وسنت سے اقرب معلوم ہوتا تھا، اس میں حدیث فہمی کا کامل معیار پیش کیا ہے اور فقہ وحدیث میں تطبیق کی راہ اچھی کھول دی ہے۔

اسرار علم حدیث

علم اسرار دین وشریعت کی مستقل بنیاد شاہ صاحب نے رکھی ہے اور اس موضوع پر آپ کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اسلامی کتاب خانہ میں متعدد حیثیتوں سے بالکل ایک انفرادی شان رکھتی ہے، یہ بنیادی طور پر حدیث کی کتاب ہے، اگرچہ اس کو بالعموم ''علم اسرار دین وشریعت'' کا قاموس کہا اور سمجھا جانے لگا ہے، ماہرین فکر ولی اللہی نے اس کا موضوع فن حدیث ہی قرار دیا ہے، خود شاہ صاحب بھی اسے اسرار حدیث کی کتاب سمجھا کرتے تھے، حجۃ اللہ (اص ۱۶۷)

اس کتاب میں شاہ صاحب نے عقائد سے لے کر عبادات، معاملات، احسان وتزکیہ، مقامات واحوال، کسب معیشت کے طرق، تبرع وتعاون، تدبیر منزل، خلافت، قضا، جہاد، آداب طعام، آداب صحبت، معاشرت اور آخر میں فتن، حوادث مابعد اور علامات قیامت تک کی احادیث کے اسرار وحکم سے بحث کی ہے اور اس سلسلہ میں سیرت نبوی کا خلاصہ بھی پیش کر دیا ہے، ان اسرار وحکم کے بیان کرنے کا مقصد تمدن اور اخلاقیات کے درمیان رشتوں کو استوار کرنا اور عقل ونقل کے درمیان تطابق ثابت کرنا تھا تاکہ معترضین کو ان پر اعتراض کرنے اور حدیث وسنت کی قیمت و افادیت اور ان کی اہمیت وضرورت کو کم کرنے اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کا موقعہ نہ ملے۔

حجہ کی اہمیت وافادیت پر فکر ولی اللہی کے ماہرین نے کافی لکھا ہے، اس کی اہمیت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اسرار شریعت پر اس غیر مسبوق کتاب کو اساطین علم وفن نے اپنا مرجع بنایا ہے، جیسے مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ''المصالح العقلیۃ'' میں علامہ شبلیؒ نے ''سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، علم الکلام'' اور ''الکلام'' میں مولانا مودودیؒ نے تعدد ازدواج وغیرہ میں، مولانا غنی میاں ندویؒ نے ''ارکان اربعہ'' میں، میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ نے ''معیار الحق'' میں، مولانا عبدالعزیز محمدی رحیم آبادیؒ نے حسن البیان نیمانی سیرۃ النعمان میں، شیخ الحدیث محمد اسمٰعیل سلفیؒ گوجرانوالہؒ نے تحریک آزادی فکر اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تجدیدی مساعی میں بھرپور استفادہ کیا ہے۔

شروح حدیث

مؤطا جو کتب ستہ کی مصدر، مسلک مالکی کی زادراہ، مسلک شافعی واحمد کی اساس، مسلک حنفی کی چراغ ہے، شاہ صاحب نے اس کی دو شرحیں عربی وفارسی میں لکھی ہے، عربی شرح کا نام ''المسویٰ'' ہے جو فن حدیث وفقہ میں آپ کے اختیار کردہ طریقہ درس کا نمونہ ہے، اس کی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) غریب ومشکل الفاظ کی شرح۔ (۲) مشکل ومشتبہ الفاظ پر اعراب۔ (۳) حنفیہ اور شوافع کے مسالک کا بیان۔ (۴) احادیث کی فقہی انداز پر ایسی ترتیب جس کی وجہ سے استفادہ کافی آسان ہو گیا۔ (۵) ایجاز و اختصار۔ (۶) باب سے مناسبت رکھنے والی آیات کا ذکر۔ (۷) ہر حدیث سے ماخوذ مسئلہ سے حدیث کا عنوان باب قائم کرنا۔ (۸) علت حکم اور اس کی قسموں کا بیان۔ (۹) ائمہ فن نے مؤطا پر جو بیچ حدیثوں کے ذریعہ تعاقب کیا ہے لطیف انداز میں اس کی جانب اشارہ ہے (۱۰) یہ شرح مجتہدانہ شان کی مظہر اور تقلیدی بندھنوں سے بالکل آزاد ہے، شاہ صاحب نے تخریج حدیث سے تعرض نہیں کیا ہے کیونکہ مسند الدارمی اصلاً روایات مؤطا کی سندوں کے ذکر کے لیے ہی لکھی گئی ہے۔

المصفی

مؤطا امام مالک کی فارسی زبان میں بہترین شرح ہے جس کے دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مصنف کو حدیث وفقہ نیز استخراج مسائل میں کتنا ملکہ حاصل تھا اس کی اہم خوبیاں درج ذیل ہیں:

(۱) یہ مؤطا کی تلخیص ہے، اس میں صرف احادیث وآثار کی شرح کی گئی ہے، امام مالکؒ کے اقوال اور ان کے بلاغات حذف کر دیے گئے ہیں۔

(۲) مجتہدانہ شان کی حامل شرح ہے۔ (۳) ہر باب میں مناسب آیات کا اضافہ ہے نیز آیات اور احادیث کا فارسی ترجمہ بھی درج کیا گیا ہے۔

(۴) غریب الفاظ کی شرح۔ (۵) مذاہب فقہاء (حنفیہ اور شوافع) کا بیان۔ (۶) ہر حکم کی علت کے استخراج کی کیفیت اور اس کے توسط سے قواعد کلیہ کا بیان۔ (۷) مؤطا نیز امام مالکؒ پر امام شافعی وغیرہ کے تعقبات کا تذکرہ۔ (۸) مراسیل کو موصولا بیان کرنا یا ان کے متابعات و شواہد کی فراہمی۔ (۹) صحابہ وتابعین اور فقہاء کے اقوال کے مآخذ کی تعیین۔

۳۔ شرح تراجم صحیح بخاری

یہ رسالہ بقول علی میاں ندویؒ: ''یہ انتہائی مختصر رسالہ معانی سے بھرپور، اصولی قواعد وحکمتوں سے لبریز، تراجم بخاری کو سمجھنے میں اصل واساس، جیسا کہ یہ وصف آپ کی ہر کتاب میں ہی پایا جاتا ہے۔

آغاز میں مصنف علیہ الرحمہ نے تراجم کے سلسلے میں انتہائی قیمتی اور اصولی باتیں بیان فرمائی ہیں جن سے مقاصد تراجم تک پہنچنے میں کافی مدد ملتی ہے، اس میں جملہ ابواب کے بجائے ہر کتاب سے مشکل ترین ابواب کی شرح کی گئی ہے۔

۱۔ ابواب کی تشریح کے ساتھ ساتھ ان کے تحت وارد احادیث کے مشکل کلمات کی جامع تشریح۔

۲۔ ایجاز و اختصار۔

۳۔ بخاری کے ابواب پر وارد کیے جانے والے اہم اشکالات و شبہات کا ازالہ۔

۴۔ اگر امام بخاری نے تراجم ابواب میں کسی حدیث یا واقعہ کی جانب اشارہ کرنا چاہا ہے تو شاہ صاحب نے بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ اس کی وضاحت فرما دی ہے، مثلاً "باب عمود الفسطاط تحت وسادتہ" کے تحت وہ رقم طراز ہیں:

"اشار بہذہ الترجمۃ الی الحدیث اخرجہ احمد بسند صحیح" الخ،

مختصر یہ کہ مقاصد ابواب و تراجم میں رسائی حاصل کرنے کے سلسلے میں یہ انتہائی مفید اور معاون ہے۔

۴. چہل حدیث

یہ کتاب فارسی میں عوام کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں انتہائی مختصر احادیث کا انتخاب کیا گیا ہے۔

۵. افادات شاہ علی صحیح البخاری

بخاری شریف کا وہ نسخہ جو شاہ صاحب نے اپنے سامنے رکھ کر اپنے شاگردوں کو تعلیم دی تھی اور جس پر ان کے ایک شاگرد شیخ محمد بن پیر محمد الہ آبادی کے قلم سے شاہ صاحب کے افادات لکھے گئے ہیں، یہ خدا بخش لائبریری میں مخطوطات میں محفوظ تھا جو شاہ ولی اللہ اکیڈمی علی گڑھ کے ذریعہ ابھی حال ہی میں طبع ہوا ہے۔

۶. تراجم بخاری

یہ صحیح بخاری کی وسعت وغایت اور اصولی ترتیب پر مختصر تبصرہ ہے۔

۷۔ آثار المحدثین۔ ۸۔ مکتوبات مع مناقب امام بخاری و ابن تیمیہ یہ کتاب فارسی میں ہے۔

شاہ صاحب کی مؤلفات کی اہم خوبیاں اور ان کا اسلوب

فن حدیث ہو یا علم فقہ، اسرار شریعت ہو یا اصول تفسیر، ان جملہ موضوعات پر آپ کی لکھی

کی کتابوں کی اہم خوبیاں سبقت و اولیت، دقت نظر، وسعت نظر، سلامت فہم، سلاست بیان، قوت انشاء و تعبیر ہے نیز آپ نے ہر کتاب میں اعتدال کا دامن اپنایا ہے جس سے بعد کے ادوار میں تعصب، تنگ نظری، تقلید جامد اور لاطائل بحثوں میں تضییع اوقات کا سلسلہ بڑی حد تک رک گیا اور اجتہاد و تحقیق کا دروازہ کھل گیا۔ آپ کا اسلوب جامعیت زور بیان تحکم اور فصاحت میں نبی ﷺ کے طرز تکلم سے مشابہ ہے۔

ترجمہ کتب حدیث

شاہ صاحب کا ایک انتہائی مجددانہ کام جو آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے وہ قرآن وحدیث کے ترجمہ کی بنیاد ڈالنا ہے، آپ نے فارسی زبان میں قرآن مجید اور موطا امام مالک کا ترجمہ کیا اور جب اردو نے قدم بڑھایا تو شاہ رفیع الدین صاحب نے لفظی ترجمہ اور شاہ عبد القادر نے بامحاورہ ترجمہ اپنے والد کی اقتداء میں کیا اور اب تو قرآن وسنت کے ترجمے شرحیں اور تفاسیر کا انبار لگ گیا، عہد محکومی میں ان ترجموں نے مسلمانوں اور اسلام و ایمان کی حفاظت میں کیا کام کیا ہے، اس کا صحیح اندازہ کرنا آسان نہیں، پھر ان ترجموں کی بدولت جو عربی زبان سے ناواقف تھے وہ بھی خدا کے سامنے کھڑے ہوگئے اور خود ان آنکھوں سے بغیر کسی مولوی عالم کے واسطہ کے قرآن وسنت اور سیرت مطہرہ کا مطالعہ کر رہے ہیں اور جیسا کہ شاہ عبد القادر نے لکھا ہے:

"بتانے والے بہتیرا بتائیں جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں بتایا ہے ویسا کوئی نہیں بتا سکتا اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے کسی کے کلام میں نہیں" (مقدمہ موضح القرآن ص ۱۴)

اثرات: شاہ صاحب کی خدمت کے ثمرات کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ حدیث نصاب کا جزء قرار پائی۔

۲۔ درس حدیث کے حلقے قائم ہوئے۔

۳۔ صحاح ستہ کے دورے کا آغاز ہوا۔

۴۔ فقہ مقارن کا آغاز ہوا۔

۵۔ ہند میں شروح حدیث کا آغاز ہوا۔

۶۔ ہند اور عرب میں اجازت حدیث اور سند کا شوق پیدا ہوا۔

۷۔ ترجمے نے اعتراضات کے دفاع میں اہم رول ادا کیا۔

۸۔ فقہی تعصب میں کمی ہوئی۔

۹۔ تحریک عمل بالحدیث کی بنیاد پڑی۔

۱۰۔ باب الاجتہاد قدسد کا ازالہ ہوا۔

انہیں عظیم اثرات کی بنا پر علامہ رشید رضا مصری کو یہ اعتراف کرنا پڑا (اگر ہمارے بھائیوں علمائے ہندوستان نے اس زمانے میں علوم حدیث کے ساتھ اعتناء نہ کیا ہوتا تو مشرقی ممالک میں مکمل طور پر ان کا زوال ہو چکا ہوتا)

آپ کی ان عظیم حدیثی خدمات کو نواب سید صدیق حسن خاں نے یوں خراج عقیدت پیش کی ہے۔

من زار بابک لم تبرح جوارحه   تروی احادیث ما اولیت من منن

فالعین عن قرة والکف عن صلة   والقلب عن جابر والسمع عن حسن

☆☆☆

"ماضی میں خاص طور پر دینی مدارس کی روایت یہ رہی ہے کہ اساتذہ اور طلبہ میں عمر بھر قائم رہنے والا ایک روحانی رشتہ ہوتا تھا۔ استاذ اپنے طلبہ کے لئے ایک مشفق باپ، ان کا اخلاقی اور روحانی مربی اور علم و عمل دونوں کے میدان میں ایک شفیق نگراں کی حیثیت رکھتا تھا، جو طلبہ کے نجی معاملات تک میں دخیل ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ اپنے اساتذہ سے علمی استفادہ کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بھی حاصل کرتے تھے، ان سے زندگی کا سلیقہ اور دوسرے اخلاقی فاضلہ سیکھتے تھے اور اس طرح شاگرد اپنے استاذ کے علم و عمل کا آئینہ ہوا کرتا تھا۔ اب رفتہ رفتہ یہ باتیں داستان پارینہ ہوتی جا رہی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ استاذ نے اپنا مقصد صرف کتاب پڑھانا بنالیا ہے، رہی یہ بات کہ طلبہ کو مفید تر بنانے کے لئے انہیں کن کاموں کا مکلف کرنا ضروری ہے، کون سے رجحانات ان کے علم و عمل کے لئے مضر ہیں اور انہیں کیسے ختم کیا جا سکتا ہے، طالب علم درسگاہ سے باہر کس قسم کی زندگی گزارتے ہیں.....؟ ان سوالات کے بارے میں سوچنے اور ان مقاصد کی لگن رکھنے والے اساتذہ مفقود ہوتے جا رہے ہیں، الا ماشاءاللہ....." (مولانا مفتی محمد تقی عثمانی)

تعلیم کے بنیادی مقاصد

ولی اللہ مجید قاسمی ☆

تاریکی اپنے ساتھ وحشت لے کر آتی ہے، سانپ اور بچھو کا ڈر، چوری کا اندیشہ، عزت و آبرو لٹ جانے کا خوف، جنات و شیاطین، بھوت پریت کی دہشت، ہزاروں وسوسے اور اندیشے اور صبح کے آثار نظر آتے ہی تمام اندیشے بادل کی طرح چھٹ جاتے ہیں۔

جہالت بھی ایک طرح کی تاریکی ہے اور اپنے ساتھ ہزاروں خرابیاں لے کے آتی ہے۔ ہر ایک برائی سے نبرد آزما ہونے کے لئے ایک طویل مدت درکار ہے پھر بھی کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں..... علاج صرف ایک ہے۔ علم کی شمع جلائی جائے، روشنی پھیلتے ہی جہالت کی تمام برائیاں خود بخود مٹ جائیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ جب اسلام کا آفتاب عالم تاب طلوع ہوا تو اپنے جلو میں علم و قلم کی نوید لے کر آیا اور سب سے پہلی "وحی" پڑھنے اور لکھنے سے متعلق نازل ہوئی۔۔ حالانکہ اس وقت عربوں اور دیگر قوموں میں بہت سی ایسی برائیاں تھیں جن پر ایک مصلح کی نگاہ جا کر ٹھہر سکتی تھی، شرک و بت پرستی اپنی انتہا کو چھو رہی تھی، پوری قوم لامرکزیت اور اختلاف و انتشار کا شکار تھی، سیکڑوں دیوی اور دیوتاؤں کی طرح انسانی سماج بھی ان گنت حصوں میں بٹا ہوا تھا، ظلم و جور کی حکمرانی تھی، بے حیائی اور بے شرمی کا چلن تھا، انسانیت دم توڑ رہی تھی، اور حیا ایک گوشے میں کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔

غور کرنے کی ضرورت ہے کہ پہلی وحی میں ان برائیوں میں سے کسی کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اس کی جگہ لکھنے اور پڑھنے کا تذکرہ ہے، اس لیے کہ جہالت کی کوکھ ہی سے تمام برائیاں جنم لیتی ہیں، اور علم ہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے تمام اچھائیاں پھوٹتی ہیں، اس لیے سب سے پہلے علم کی ضرورت ہے کہ کسی سماج میں جب علم کا سورج طلوع ہوگا تو وہ جہالت کو جلا کر خاکستر کر دے گا۔

یہی وہ روشنی ہے جس کے ذریعہ شرک و بت پرستی کی قباحت اور توحید کی حقیقت جانی جا سکتی ہے، ارشاد خداوندی ہے۔

☆ استاذ حدیث و فقہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ

شهد الله انه لا اله الا هو والملائکة و اولو العلم ۱۔

اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں اور فرشتوں نے بھی اور علم والوں نے بھی۔

یہ اہل علم ہی ہیں جو اللہ کے پیغام کو سمجھتے اور اس کے ذریعے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں

وتلک الامثال نضربها للناس وما یعقلها الا العالمون ۲۔

اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور اہل علم ہی اس طرح کی چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں۔

ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منهم لعلمه الذین یستنبطونه منهم ۳۔

خوف و امن کی بات کو اگر یہ لوگ رسول اللہ ﷺ یا اپنے حاکموں کے حوالے کر دیتے تو ان میں سے جو استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اس کی حقیقت کو جان لیتے۔

تعلیم کی اثر انگیزی اور ہمہ گیری:

کسی بھی سماج اور معاشرہ کی تشکیل میں تعلیم اور مقصد تعلیم کا موثر ترین کردار ہوتا ہے۔ انسانی زندگی اور طرز حیات پر تعلیم کا بڑا گہرا اور دیر پا اثر ہوتا ہے، مولانا محمد رابع حسنی ندوی لکھتے ہیں:

> ''یوں تو باضابطہ تعلیم اگرچہ معاشرہ کے ایک خاص طبقہ کو دی جاتی ہے۔ یعنی کم عمر طبقہ اور بچوں کو لیکن وہ نتیجۃً پورے معاشرے پر محیط ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت اس طور پر کی جا سکتی ہے کہ ہم جس نسل کو تعلیم دیتے یا دلواتے ہیں یہ نسل زیادہ سے زیادہ بیس سال کی مدت میں معاشرہ میں اپنی کمزور ترین اور بے اثر سطح سے نکل کر معاشرہ کی موثر ترین سطح پر آ جاتی ہے اور سماج کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، یعنی جوان طبقہ جو سماج کی ہر قوت و اہمیت کی ذمہ داری کا حامل بنتا ہے۔''

اکبر الہ آبادی نے اسی لحاظ سے تعلیم کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ شعر کہا تھا۔

وہ قتل سے بچوں کے یوں بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

یعنی اگر وہ بنی اسرائیل کے شیر خوار بچوں کو قتل کرنے کے بجائے ان کی تعلیم کا بندوبست کر دیتا جو قبطی اور فرعونی ذہن کے اساتذہ دیتے

اور فرعونی ذہن کا نظام اور انتظام ہوتا اور مقاصد تعلیم بھی اسی ذہن کے مطابق ہوتے تو پھر وہ بچے بڑے ہونے کے بعد بنی اسرائیل کے بجائے فرعون کے مقاصد کے کام کے بن جاتے اور بغیر قتل کے نتیجہ قتل حاصل ہو جاتا۔

تعلیم کا مقصد:

تعلیم کا مقصد متعین کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس کائنات میں خود انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اگر انسان ایک سماجی جانور ہے جیسا کہ اہل مغرب کا نظریہ ہے تو ظاہر ہے کہ جانور کی تعلیم کا مقصد پیٹ بھرنے اور جسمانی آسودگی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس کے علاوہ تعلیم کا جو بھی مقصد ہوگا وہ ذیلی اور ضمنی ہوگا۔ اور ہر ایک کی گردش اسی محور کے ارد گرد ہوگی۔ اور اگر اسلامی نقطہ نظر کے مطابق انسان کو اللہ کا بندہ اور خلیفہ قرار دیا جائے تو پھر اس کی تعلیم کا مقصد ہوگا کہ رب کی بندگی کے تقاضے کیا ہیں، اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ذرائع کیا ہیں وہ کیا چیزیں ہیں جو اسے قیادت ارضی کا اہل بناتی ہیں۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو اسے علم و بصیرت کی دولت سے مالا مال کر دے۔ زندگی کی ابدی اور روحانی حقیقتوں کا ادراک کرا سکے، سائنس اور معاشرتی علوم کے بنیادی حقائق کے سمجھنے کے لائق بنا سکے، فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھائے، طبعی رجحانات کو صحیح رخ پر ڈال سکے، انفرادی، عائلی اور اجتماعی حیثیت سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں نبھا سکے۔ اسلام نے مقصد تعلیم کو جو وسعت اور ہمہ گیری عطا کی ہے اس کی مثال نہیں ہے۔ روحانی، ذہنی، جسمانی، انفرادی، عائلی، اجتماعی اور اخلاقی تعلیمات جیسے اعلیٰ اور پاکیزہ مقاصد کو صحیح مقام اور اہمیت دی، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے درمیان بہترین سیرت و کردار کے حامل حکمراں، مدبر، مفکر اور سائنس داں پیدا ہوئے، جن کے عظیم کارناموں کے سامنے دنیا حیرت زدہ ہے۔

اسلامی مقصد تعلیم:

اسلامی مقصد تعلیم کی وسعت اور ہمہ گیری کو سمیٹا جائے تو وہ ایک لفظ سے عبارت یعنی اللہ کا صالح بندہ بنانا، ارشاد ربانی ہے:

ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون ۵۔

لیکن تم اللہ والے بن جاؤ یہ اس لیے کہ تم پڑھاتے ہو آسمانی کتاب کو اور خود بھی اسے پڑھتے ہو۔

تعلیم کا یہ عمومی اور بنیادی مقصد ہے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے، بچوں کی تعلیم و تربیت میں درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا ہوگا۔

۱۔ عقیدہ وایمان کی جڑیں مضبوط کرنا:

ہمارا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ پچھلے جنم کے پاپ کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ بالکل پاک وصاف پیدا ہوتا ہے، اور اس میں فطری طور پر قبول حق کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ ۷

اور طفولیت، عمر کا وہ حصہ ہے جس میں انسان کے مزاج اور بنیادی رجحانات کی تشکیل ہوتی ہے، یہ عمر کا وہ مرحلہ ہے جس میں تعلیم وتربیت کا نتیجہ بڑا گہرا اور دور رس ہوتا ہے یہ اسی لیے حکم دیا گیا ہے کہ دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے قبول حق کے اسی استعداد کی طرف توجہ دی جانی چاہیے، اور اس کے کان میں اذان اور اقامت کے الفاظ کہنے چاہیے ۸

اور جب بچہ بولنے کے لائق ہو تو سب سے پہلے اس کی زبان سے وحدانیت کا کلمہ نکلنا چاہیے ۹

اور جب شعور کی منزل سے قریب ہونے لگے تو عقیدہ وایمان کی جڑوں میں آبیاری ہونی چاہیے، اس کے سامنے ایسے واقعات لائے جائیں جن سے اللہ کی وحدانیت، اللہ اور اس کے رسول کی محبت، اسلامی تعلیمات کی اہمیت اور دولت اسلام کی قدر وقیمت سے آگاہ ہو سکے، اسلام کی تاریخ اور اسلاف کے قصے سنائے جائیں جس کے ذریعہ عقیدہ سے جذباتی وابستگی، جرأت وشجاعت اور ہمت وبہادری جیسی صفات کی حوصلہ افزائی ہو اور جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اسلام وہ نظریہ حیات اور ضابطہ زندگی ہے جو دین ودنیا کو جامع ہے اور یہ ایک مکمل نظام حیات ہے، جس سے بہتر دنیا میں کوئی اور نظام اور نظریہ نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو طفولیت کے دوران اللہ کے رسول ﷺ نے جو کلمات سکھائے تھے اس سلسلے میں انہیں بنیادی پتھر سمجھنا چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

> یا غلام انی اعلمک بکلمات احفظ اللہ یحفظک،
> احفظ اللہ تجدہ تجاھک، اذا سألت فاسأل اللہ و اذا استعنت
> فاستعن باللہ واعلم ان الامۃ لو اجتمعت علی ان ینفعوک بشی
> لم ینفعوک الا بشی قد کتبہ اللہ لک وان اجتمعوا علی ان
> یضروک بشی لم یضروک الا بشی قد کتبہ اللہ علیک
> رفعت الاقلام وجفت الصحف ۱۰۔

بچے! میں تمہیں چند کلمات بتا رہا ہوں، اللہ کو یاد رکھو، اللہ تمہیں

یاد رکھے گا، اللہ کو یاد رکھو، اسے اپنے سامنے پاؤ گے، جب کچھ مانگنا ہو تو اللہ سے مانگو، جب مدد لینا ہو تو اللہ سے مدد لو، یاد رکھو، اگر تمام لوگ مل کر تمہیں کچھ فائدہ پہونچانا چاہیں، تو صرف اتنا ہی فائدہ پہونچا سکتے ہیں جتنا پہلے سے اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، اور اگر نقصان پہونچانا چاہیں تو اللہ کے لکھے ہوئے سے زیادہ نقصان نہیں دے سکتے، قلم رکھ دیا گیا اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔

اسی مرحلے میں بچوں کو اسلام کی روشن تاریخ اور اسلامی تعلیمات سے آگاہ، اور عبادات کا عادی بنانا چاہیے، حضرت سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو اللہ کے رسول ﷺ کے غزوات سے باخبر کرنے کے لیے وہی اہتمام کرتے تھے جو قرآنی سورہ کے سکھانے کے لیے کرتے تھے ۱۱ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> اپنے بچوں کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو اور دس سال کی عمر
> میں نماز چھوڑنے پر ان کی پٹائی کرو اور ان کے بستر الگ کر دو ۱۲

۲۔ غیر اسلامی نظریہ اور تہذیب سے حفاظت:

جہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ بچوں کے ذہن میں عقیدہ وایمان کی اہمیت، حقانیت اور برتری کو پیوست کیا جائے، اسلام کو ایک کامل اور کامیاب نظریہ حیات کے طور پر پیش کیا جائے وہیں اس کی بھی شدید ترین ضرورت ہے کہ غیر اسلامی نظریات اور تہذیب کے زہریلے اثرات سے ان کے معصوم ذہنوں کی حفاظت کی جائے۔ حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو جن باتوں کی نصیحت کی تھی ان میں سب سے اہم اور پہلی نصیحت یہ ہے۔

> یابنی لاتشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم ۱۳۔
> بیٹے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

حضرت لقمانؑ کی اس پوری نصیحت میں تعلیم وتربیت کے تمام بنیادی مقاصد کا خاکہ موجود ہے، چنانچہ اللہ کی وحدانیت اور شرک سے اجتناب، انفرادی اور عائلی ذمہ داریاں، سماجی تعلقات اور سیرت وکردار سازی میں سے ہر بنیادی بات کا ذکر ہے۔

اس وقت تعلیم وتربیت کے حوالے سے مسلمانوں کو دو طرح کی یلغار کا سامنا ہے، ذرائع ابلاغ اور وسائل تعلیم کے ذریعہ مغربی افکار وتہذیب کو۔ جو عریانیت، فحاشی، تشکیک، لامذہبیت، مفاد پرستی سے عبارت ہے۔ فروغ مل رہا ہے، اپنی روشن تاریخ اور بے مثال تہذیب سے ناواقفیت

کی وجہ سے مسلمان بچے ان چیزوں سے مرعوب ہو رہے ہیں، اور اپنے افکار و اقدار کے تعلق سے احساس کمتری میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ ان میں بے حیائی اور بد اخلاقی کو بڑھاوا مل رہا ہے۔

دوسری طرف بھارتی حکومت ہندوانہ اور مشرکانہ رسوم و افکار کو مسلط کرنے کی کوشش میں مبتلا ہے بچوں کو شرک اور مشرک شخصیات سے قریب کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، ہندو میتھالوجی اور رسوم و رواج اور کلچر کو برتر اور بہتر ذہن نشین کرایا جا رہا ہے۔ یوگا کو ایک ورزش کے طور پر متعارف کرایا جا رہا ہے، تعلیم اور ذرائع ابلاغ جیسے ٹی وی وغیرہ کے ذریعہ مشرکانہ تہذیب کو مسلم گھروں میں داخل کیا جا رہا ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ مسلمانوں کے زیر انتظام چلنے والے اداروں میں بھی وہی کتابیں داخل نصاب ہیں جن میں ہندو اور عیسائی اثرات نمایاں ہیں، اکبر مرحوم نے بڑے کرب اور حسرت کے ساتھ کہا تھا:

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

لیکن اب تعلیم کے ساتھ الحاد کے آنے کی خبر عام ہو چکی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ والدین بچوں کی دینی تعلیم پر پوری توجہ دیں۔ اور اپنے گھروں میں مشرکانہ تہذیب کو داخل نہ ہونے دیں۔ اور درسگاہوں میں مغربی اور ہندوانہ تہذیب اور رسوم و افکار کے مضر اثرات سے آگاہی کا خاطر خواہ نظم ہونا چاہیے۔

۳۔ سیرت و کردار سازی:

جس انسانی وجود کو دنیا میں قدم رکھتے ہی وحدانیت کا کلمہ سنایا گیا ہو، اللہ اور اس کے رسول کی محبت ماں کے دودھ میں شامل ہو، اللہ کا خوف اور نگرانی کا احساس خون بن کر رگوں میں دوڑ رہا ہو، اسی پر اعتماد اور بھروسہ، زندگی کے ہر قدم پر اس کی مدد اور دستگیری کا یقین اور ہر معاملہ میں اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے پر جس کی پرورش ہوئی ہو یقینی طور پر وہ ہر اچھے کام اور اچھی عادت کی طرف لپک کر آئیگا یہ چیزیں اس کی فطرت کی آواز اور عقل و خرد کی نگاہ میں مانوس اور پسندیدہ چیز ہوگی، اور وہ برے اخلاق سے بدک کر بھاگے گا اس لیے کہ یہ اس کے لیے ایک اجنبی، غیر مانوس اور قبیح چیز ہوگی۔ بچے کے اندر موجود اس فطری صلاحیت کو تعلیم کے ذریعہ پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔

سیرت و کردار سازی کے لیے قرآن میں ایک بڑا جامع لفظ "تزکیہ" استعمال کیا گیا ہے۔ تزکیہ کا مفہوم ہے پاک و صاف کرنا، نشوونما دینا اور سنوارنا اور اس میں زندگی کا ہر پل اور ہر مرحلہ

شامل ہے، خواہ اس کا تعلق نجی زندگی سے ہو یا اجتماعیت سے، عبادات ہو یا معاشرت، خیالات و افکار ہوں یا اخلاق و عادات، تہذیب و ثقافت ہو یا سیاست، ہر چیز کو پاک کرنا اور سنوارنا اس میں شامل ہے۔ حدیث میں اس کے لیے "احسان" کا لفظ اختیار کیا گیا ہے، اور اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں اس "احسان" کو فرض قرار دیا ہے[15] یہاں تک کہ دشمن کو قتل کرنے میں بھی اس خوبی کی رعایت ضروری ہے۔ اور چہرہ بگاڑنے، پیٹ چیر دینے یا اس کے علاوہ کوئی ایسی حرکت کرنے کی اجازت نہیں ہے جس سے انسانیت کی اہانت ہوتی ہو۔

انسان کے اندر خیر و شر دونوں طرح کی قوت موجود ہوتی ہے، تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ خیر کی قوت کو طاقت ور بنائے "تقویٰ" کے میلانات کو پروان چڑھائے اور شر کی قوت کو کمزور اور برائی کے رجحانات کو بے اثر کر دے، ایک بچے کے لیے والدین اور اساتذہ کی طرف سے یہ ایک بہترین تحفہ ہے[16] اور ان کی ذمہ داریوں میں شامل ہے کہ وہ بچے کو اچھے اخلاق سے آراستہ کریں اور برے کردار و عمل سے دور رکھیں، حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اکرموا اولادکم واحسنوا ادبهم[17]۔

اپنی اولاد کی عظمت کو پہچانو اور انہیں اچھے آداب سے آراستہ کرو۔

من حق الولد علی الوالد ان یحسن ادبه ویحسن اسمه[18]۔

باپ پر بچے کا یہ حق ہے کہ وہ اسے اچھے آداب سکھائے اور اچھا نام رکھے۔

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

علموا اولادکم واهلیکم الخیر وادبوهم[19]۔

اپنے بچوں کو اور گھر والوں کو اچھی باتیں سکھاؤ اور انہیں آداب سے آراستہ کرو۔

۴۔ صلاحیتوں کی نشوونما:

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو بے شمار صلاحیتوں اور خصوصیتوں سے نوازا ہے۔ شکل و صورت کے اعتبار سے مخلوقات میں سب سے خوب تر اور عقل و خرد کے اعتبار سے سب سے برتر، قدرت کی صناعی کا وہ بہترین شاہکار ہے جو ہر طرح کی خوبیوں سے مالا مال ہے، خالق کائنات کا ارشاد ہے:

وجعل لکم السمع والابصار والافئدة قلیلا ما تشکرون[20]۔

اللہ تعالیٰ نے تمہیں کان، آنکھ اور دل عطا کیا لیکن تم میں شکر گزار بہت کم ہیں۔

کان، آنکھ اور دل تعلیم کے بنیادی ذرائع میں سے ہیں، لیکن جیسا کہ آیت کے آخر میں اشارہ کیا گیا ہے، عام طور پر انسانوں نے اللہ کے دیے ہوئے ان انمول تحفوں کی قدر و قیمت نہیں پہچانی، اور خالق و مالک کی شکر گذاری کے بجائے نافرمانی اور سرکشی پر آمادہ ہوئے، ان دی ہوئی صلاحیتوں اور قوتوں کا غلط استعمال کیا گیا۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں بخشی ہیں تعلیم کے ذریعہ انہیں پروان چڑھانے اور انہیں صحیح سمت دینے کی کوشش کی جائے۔ بے سمتی کی وجہ سے ان صلاحیتوں کے متعلق باز پرس ہوگی، ارشاد ربانی ہے:

ولا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا [۲۱]۔

ایسی چیز کے پیچھے نہ پڑو جو تمہیں معلوم نہ ہو، کان، آنکھ اور دل، ہر ایک سے پوچھ ہوگی۔

حصول علم کی صلاحیت ہو یا غور و فکر کی قوت، زبان و بیان کی خوبی ہو یا تحریر و خطابت کا ملکہ، ان تمام صفات سے بچوں کو آراستہ اور مسلح کرنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی جرأت و شجاعت، دوسروں کے ساتھ شفقت و محبت، ایثار اور ہمدردی جیسی خوبیوں کو بڑھاوا دینے اور ڈر و خوف کی نفسیات، بزدلی، احساس کمتری، غصہ اور حسد جیسی برائیوں سے چھٹکارا دینے اور شرم و حیا کو باقی رکھنے اور جھجک کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔

۵۔ صحت و طاقت کی حفاظت:

ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت کی بقا، ترقی اور حفاظت کی طرف توجہ بھی ضروری ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں "طالوت" کے حکمرانی کا اہل ہونے کے سلسلے میں جن دو صفات کا تذکرہ کیا ہے ان میں ایک علمی صلاحیت ہے اور دوسری جسمانی قوت ہے[۲۲] اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ طاقت ور مومن اللہ کی نگاہ میں کمزور مومن سے زیادہ پسندیدہ اور بہتر ہے[۲۳] اور حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ اپنے بچوں کو تیراکی، تیر اندازی اور گھوڑ سواری کی تعلیم دو[۲۴]۔

۶۔ سماجی ذمہ داریاں:

فرد کی تربیت ایسے انداز سے ہونا چاہیے کہ وہ خود اپنی ذات کے لیے، اپنے خاندان کے لیے اور اپنے سماج اور معاشرہ کے لیے قومی اور بین الاقوامی برادری کے لیے مفید اور نفع بخش ثابت ہو، اسے انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس ہو، دوسروں کے ساتھ اس کا رویہ بہتر ہو، حقوق

ادا کرنے والا ہو، آداب کا پابند ہو کیونکہ ایک صالح معاشرہ اور بہترین سوسائٹی اسی وقت بن سکتی ہے جب کہ اچھے افراد تیار کیے جائیں جن میں اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر سوچنے اور عمل کرنے کا جذبہ ہو، اجتماعی مفاد کے لیے اپنے ذاتی مفاد کی قربانی دینے کے لیے آمادہ ہو۔

اسلام ایک انسان کو جن چیزوں کا پابند بنانا چاہتا ہے، ان میں سب سے اہم چیز تقویٰ ہے، یعنی ایک حساس دل، شفاف شعور، اور دائمی خشیت کے ساتھ اللہ کے تمام احکامات کا پابند ہو، زندگی کی راہ جو کانٹوں بھری راہ ہے، جس میں ہر طرف شہوات، لذات، حرص و طمع، جھوٹی امیدوں کے کانٹے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس پر خار راستہ سے اس طرح سے گذرنا کہ دامن انسانیت داغدار نہ ہو "تقویٰ" کہلاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو تمام خوبیوں کا سرچشمہ اور ہر طرح کی برائی کے لیے رکاوٹ ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر پولیس اور قانون کا خوف کسی کو جرم سے باز نہیں رکھ سکتا ہے۔ قانون سے بچنے کے ہزاروں طریقے ہیں اور پولیس کی آنکھوں میں دھول ڈالا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ صفت پیدا ہو جائے تو قانون اور پولیس کی پہونچ سے دور رہ کر بھی قانون شکنی کی ہمت نہیں ہو سکتی ہے۔

دوسری چیز جو ایک صالح معاشرہ کے قیام کے ضروری ہے وہ ہے شفقت و رحمت کا جذبہ، جو انسان کے تمام جذبات پر حاوی اور غالب ہو، اسی سے اخوت اور بھائی چارگی اور ہر جاندار کے ساتھ ہمدردی اور ایثار کی صفت پیدا ہوتی ہے عفو و درگذر اور معاف کرنے کی خوبی کی نشو و نما ہوتی ہے۔

ایک اچھے سماج کی تشکیل کے لیے تیسری چیز باہمی حقوق کی ادائیگی ہے۔ جیسے والدین، رشتہ داروں، پڑوسیوں، اساتذہ، عمر رسیدہ، کمزوروں، بوڑھوں اور دوستوں کے حقوق۔

ان سب کے ساتھ سماجی اور اجتماعی آداب سے آراستہ ہونا بھی ضروری ہے جیسے سلام اور اجازت کا طریقہ، مجلس کے آداب، گفتگو اور مزاج کا سلیقہ، مبارکبادی اور مزاج پرسی اور مریض کی عیادت کے آداب وغیرہ جن کی تفصیلات کتاب و سنت اور اخلاقیات سے متعلق کتابوں میں موجود ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام میں سماجی آداب کی جو تفصیلات ملتی ہیں۔ کسی اور مذہب اور قانون میں اس کی مثالیں نہیں ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دین اسلام محض شخصی اور انفرادی مذہب نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق پوری زندگی اور پورے سماج سے ہے۔

سماج کے تئیں ایک فرد کی یہ بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ سماج پر "صالح تنقید" کو بھی نہ بھولے اور اچھائیوں کا حکم دے۔ ان کے پھلنے اور پھولنے کے ذرائع پیدا کرے اور اچھے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرے، برائیوں کے خلاف نبرد آزما رہے، انہیں روکے اور ٹوکے، اور برے کاموں کی

حوصلہ شکنی کرے۔

اور بچوں کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ ان میں جرأت وشجاعت پیدا ہو، تا کہ حق بات کہنے میں کوئی جھجک اور خوف محسوس نہ کریں۔

مقصد تعلیم غیر مسلم مفکرین کی نظر میں:

۱۔ تعلیم برائے معاش:

مغرب اور جمہوریت کا علم برداروں کی نگاہ میں انسان ایک سماجی جانور ہے اس کی حیثیت ایک معاشی اور عمرانی عامل کی سی ہے، جو معاشرہ کی دولت مشترکہ میں اضافہ کا باعث ہے، اس لیے ان کے یہاں "تعلیم برائے معاش" ہی بنیادی مقصد ہے۔ گرچہ زبان سے اس کا اعتراف نہ کیا جائے۔ بچے کا شعور ابھی مکمل طور پر بیدار نہیں ہوتا کہ اسے موہوم "فیوچر" کے خوف اور شوق میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ بچے کے سامنے بار بار یہ دہرایا جاتا ہے کہ تعلیم حاصل کرو تا کہ دولت جمع کر کے معاشرہ میں ایک نمایاں مقام حاصل کر سکو، علم کا رشتہ رب سے توڑ کر پیٹ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

ایک اچھا پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر، سائنس داں، کاریگر اور بزنس مین بننے کی بھاگ دوڑ میں ایک اچھا انسان راستے سے کہیں گم ہو جاتا ہے اور اس کی گم شدگی کا احساس بھی نہیں رہ جاتا۔ اکبر الہ آبادی نے تعلیم کے اسی انجام کو دیکھ کر کہا تھا:

یہ بات تو کھری ہے لیکن نہیں ہے کھوٹی
عربی میں نظم ملت بی اے میں صرف روٹی
کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

تعلیم برائے معاش کو ضمنی مقصد کے طور پر ملحوظ رکھا جا سکتا ہے، اور تعلیم کے بعض مراحل میں ایسی تربیت اور ہنر ملنا چاہیے جس سے انسان ایک باوقار زندگی گذار سکے، اور اس کے لیے سب سے ضروری چیز ہے نظام تعلیم، اور نظام حکومت کے درمیان مکمل ربط تا کہ ملکی ضرورت کے مطابق معاشی عاملین کو تیار کیا جا سکے۔ لیکن معاشی عامل کو تعلیم کے بنیادی مقصد میں شامل کر لینے سے انسان ایک اچھا حیوان تو بن سکتا ہے لیکن ایک اچھا انسان بننے کی امید اس میں نہیں رکھنی چاہیے۔

۲۔ تعلیم برائے معلومات:

یعنی حصول علم کو خود مقصد بنا لینا اور جاننے کے لیے معلومات کو جمع کرنا، تا کہ بوقت ضرورت کام آئے یا مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہو کر کوئی ملازمت حاصل کر سکے۔ یہی مقصد ...

پر اسکولوں اور کالجوں میں یہی مقصد کار فرما ہے، چنانچہ افضل حسین صاحب لکھتے ہیں:

"اسی طرح سے بیشتر اساتذہ بھی تعلیم کا مقصد زبان سے خواہ کچھ بیان کریں مگر عملاً تعلیم برائے علمیت ہی کے قائل نظر آتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ طلبہ اپنی ساری توجہ لکھنے، پڑھنے، اپنی علمی لیاقت بڑھانے اور اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرنے پر مرکوز رکھیں، شخصیت کے دیگر پہلو (جسمانی، عملی، اخلاقی) ان کی نظروں سے عموماً اوجھل رہتے ہیں۔" ۲۵

تعلیم برائے "علمیت" کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس مقصد سے جو نظام بنایا جاتا ہے اور جو تعلیم گاہ قائم کی جاتی ہے وہ کردار سازی اور انسان آفرینی کی درسگاہ نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک کارخانہ ہوتا ہے جہاں بے جان پرزے ڈھالے جاتے ہیں، اس نظام تعلیم میں ساری توجہ امتحانات، سرٹیفکیٹ اور عمارت کی تزئین وآرائش پر ہوتی ہے، اور سارا سرمایہ انھیں چیزوں پر لگایا جاتا ہے اور بے چارہ استاذ اور شاگرد جن کے نام پر یہ سارا ہنگامہ برپا ہے وہ اس شور وغوغا میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں اور پڑھے لکھے جاہلوں اور تعلیم یافتہ بے کردار افراد کی کھیپ تیار ہوتی ہے۔ ۲۶

۳۔ تعلیم برائے وقت گذاری:

تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ فرصت کے اوقات کو اچھی طرح سے گذارا جا سکتا ہے یعنی ایسے علوم سیکھے جائیں جس کے ذریعہ فرصت کے اوقات کو مشغول کیا جا سکتا ہے جیسے ادب، آرٹ وغیرہ

فرصت کے اوقات کو مشغول کرنے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے خود اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام کے متعلق منقول ہے کہ وہ بسا اوقات مسجد نبوی میں بیٹھ کر زمانہ جاہلیت کے قصے بیان کیا کرتے تھے اور دوران سفر شعر وشاعری سے شغف رکھا کرتے تھے اس لیے ایسے علوم کو سیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جس سے فرصت کے اوقات کو مصروف رکھا جا سکے، اس لیے کہ انسان ہر وقت عبادت وریاضت اور کام میں مشغول نہیں رہ سکتا اس لیے تفریحی چیزوں کا جاننا بھی مقصود ہے۔ لیکن تفریح کو بھی جائز حد میں رکھنا ضروری ہے اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے ہر کام میں ایک وقت تک نشاط اور چستی ہوتی ہے اور پھر سستی آ جاتی ہے، اور جسے سستی سنت سے باقی رکھے وہ ہدایت یاب ہے اور جسے اس کے علاوہ تک پہونچا دے وہ ہلاک ہو گیا۔ الترغیب ۱/۷۸

4. تعلیم برائے شہریت:

انسان کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ وہ ریاست کے لیے فائدہ مند اور مملکت کے لیے اچھا شہری ثابت ہو۔ یہ بھی تعلیم کا ایک مقصد ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق انسان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ ریاست اور معاشرہ کا ایک جزو ہے، اس کے انفرادی وجود کو فراموش کر دیا جاتا ہے اور اسی حیثیت سے اسے تعلیم دی جاتی ہے، اور اس سے اس بات کی امید رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو اجتماعیت میں ضم کر دیگا اور اپنی شخصیت کو اجتماعی مفاد پر قربان کر دے گا، مملکت کے مفاد اور اخلاقی قدروں اور اصول کے درمیان ٹکراؤ ہونے کی صورت میں ان اصولوں کو خیر باد کہہ دے گا۔

اس مقصد کے تحت شہریوں میں وطن سے محبت اور اس کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے بلکہ وطن پرستی کی ترغیب دیجاتی ہے۔

وطن سے محبت اور خدمت کا جذبہ ایک قابل قدر صفت ہے لیکن دیکھا یہ جارہا ہے کہ وطن سے محبت کی تعلیم تنگ نظر قومیت کے سانچے میں ڈھلتی جارہی ہے اور انسانیت سے محبت اور عالمی برادری سے اخوت اور بھائی چارگی کا جذبہ سرد پڑتا جارہا ہے، اور مذہب، رنگ و نسل اور زبان کی بنیاد پر مختلف قومیتیں وجود میں آرہی ہیں اور علاقائیت کو فروغ مل رہا ہے اور جس کی وجہ سے آئے دن جنگ وجدال کی نوبت آرہی ہے۔

5۔سیرت و کردار سازی:

جمہوریت اور اشتراکیت کے علم برداروں کی نگاہ میں سیرت و کردار سازی بھی تعلیم کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے، یہاں بعض غیر مسلم مفکرین کے اقوال نقل کیے جارہے ہیں تا کہ اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

☆استاذ کا سب سے اہم کام نہ تو عضلات کو مضبوط بنانا ہے اور نہ جذبات کو شائستہ کرنا ہے بلکہ سیرت کو مضبوط بنانا ہے۔ (ریمانٹ)

☆میں بچوں میں ہمت، طاقت، نیکی، خود فراموشی پیدا کرنا چاہتا ہوں، میرا خیال ہے کہ اگر ہم بچہ کی سیرت کی تشکیل میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو سماج خود بخود سدھر جائے گا۔ (گاندھی جی)

☆تعلیم کا مقصد مثالی انسان کی تشکیل ہے۔ (چین)

☆تعلیم ایک ہنر ہے جس سے ماہرین خصوصی نہیں بلکہ انسان بنائے جاتے ہیں۔ (مانٹین)

☆عام طور پر انسانیت کا اعلیٰ ترین مقصد اخلاق تسلیم کیا جاتا ہے بنا بریں تعلیم کا بھی (ہربارٹ)

بلاشبہ سیرت کی تشکیل تعلیم کا سب سے اہم مقصد ہے، اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ یہی وہ خوبی ہے جس کے ذریعہ انسان اور حیوان کے درمیان فرق کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم کا تصور ہی "اخلاق" سے عبارت ہے کسی تعلیم یافتہ بدکردار شخص کو دیکھ کر لوگ حیرت اور تعجب سے سوال کرتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر بھی یہ شخص بداخلاقی کیوں کر رہا ہے؟

لیکن توجہ طلب یہ ہے کہ مذہب کو انفرادی معاملہ قرار دینے اور اجتماعیت و ریاست سے بے دخل کر دینے کے بعد سیرت و کردار سازی، مردم گری اور انسان آفرینی کی بنیاد کیا ہوگی؟ کون سا داعیہ اور جذبہ ہوگا جس کی بنیاد پر کوئی شخص ناموافق ماحول میں بھی اچھے اخلاق و کردار اور اصول واقدار کے دامن سے چمٹا رہیگا؟ معاشرہ کا خوف؟ سماج کا ڈر، قانون کی گرفت میں آجانے کا اندیشہ؟ کیا ان میں سے کوئی اچھے اخلاق و کردار کے اپنانے کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کر سکتا ہے۔ جھوٹ کو سچ کے سانچے میں ڈھال کر مختلف جھوٹی مصلحتوں کا سہارا لیکر معاشرہ کو مطمئن کیا جاسکتا ہے، مختلف تدبیروں کے ذریعہ قانون سے بچا جاسکتا ہے، خصوصاً جبکہ نہ سماج کا ڈر ہو اور نہ پولیس کی پہونچ کا کیا وہاں ملک سے وفاداری کا سودا نہیں کیا جاسکتا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ ریاست سے مذہب کو نکال دینے کے بعد اخلاق و کردار اور اصول واقدار کی حیثیت بے بنیاد عمارت اور بے مفہوم الفاظ کی رہ جاتی ہے، خود مغربی مفکرین کو اس حقیقت کا احساس ہے، چنانچہ مشہور فلسفی اور مفکر کانٹ کہتا ہے "تین چیزوں پر اعتقاد کے بغیر اخلاق کا کوئی وجود نہیں ہے، اللہ کا وجود، روح کا باقی رہنا اور مرنے کے بعد حساب و کتاب"

اور ایک جرمن فلسفی "فیختا" لکھتا ہے کہ دین کے بغیر اخلاق ایک بیکار چیز ہے"

برطانیہ میں ایک وزیر کو جنسی جرائم کا مرتکب پایا گیا، اس کے خلاف فیصلہ سناتے ہوئے جج نے بڑے کرب اور افسوس کے ساتھ کہا تھا کہ: "دین کے بغیر اخلاق کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے اور اخلاق کے بغیر کوئی قانون نہیں چل سکتا ہے"

اور سید محمد رابع ندوی لکھتے ہیں:

"اخلاقیات میں سے مذہب کی بے دخلی ایک خطرناک اقدام تھا جس کا آج کے نظام تعلیم کے نتائج میں تجربہ ہو رہا ہے، در اصل اخلاقیات انسانی زندگی میں صحیح رنگ اور نکھار پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں، اور ان کا مذہب سے چولی دامن کا ساتھ ہے، اگر ان دونوں کے مابین تفریق کی جاتی ہے تو ایک تو اخلاقیات اپنی

اصل اور مضبوط بنیاد سے محروم ہو جاتی ہے، دوسرے انسانی زندگی میں ان کا اصل کردار ختم ہو جاتا ہے، اگر مذہب کی بنیاد ختم ہو جائے تو پھر آدمی سچ کیوں بولے، ناروا حرکات سے کیوں باز رہے، ظلم و نفع اندوزی اور نفس پرستی سے کیوں گریز کرے، ان میں سے کسی بھی بری بات سے گریز کا موثر محرک باقی نہیں رہتا، اگر کوئی محرک تلاش کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف مادی نفع و ضرر ہے۔ اس لیے مذہب کو اخلاقیات سے بے دخل کرنے والے اخلاقیات کا رشتہ مادی مصالح سے جوڑتے ہیں۔ حالانکہ یہ تعلق بے جوڑ اور بے نتیجہ سا ہو جاتا ہے، چنانچہ مغربی تمدن میں اخلاقیات صرف قانون اور مادی دباؤ کے دائرے تک محدود رہتی ہیں، بذات خود اپنی کوئی اساس نہیں رکھتی، غالباً اسی پیچیدگی کی وجہ سے مغربی نظریات میں مزید یہ نظریہ پیدا ہو گیا ہے کہ اخلاقیات سرے سے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی ہیں، یہ صرف مفروضات ہیں، جہاں جیسی مصلحت ہو وہاں ان کو ویسا ہی ڈھال لیا جانا چاہیے"۔(۲۹)

صحت و طاقت کی حفاظت، انفرادیت کی نشو و نما، صلاحیتوں کو پروان چڑھانا، خاندان اور سماج کی ذمہ داریوں کا اہل بنانا بھی غیر مسلم مفکرین کے یہاں مقاصد تعلیم میں شامل ہیں اور اسلامی مقاصد تعلیم کے ذیل میں ان پر لکھا جا چکا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اسلام کی نگاہ میں تعلیم کا مقصد ہے انسان کو اللہ کا نیک بندہ اور زمینی خلافت کا اہل بنانا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کے دوران درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا ہوگا۔

۱۔ عقیدہ و ایمان کی جڑوں کو مضبوط کرنا، اسلامی افکار و نظریات اور تعلیمات کی بہتری اور برتری کو پیوست کرنا، اسلام کو ایک مکمل دین، کامل نظریہ حیات اور ضابطہ زندگی کے طور پر پیش کرنا، جو زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر میدان میں رہنمائی کرتا ہے۔

۲۔ حق و باطل اور اچھے اور برے میں فرق کرنے کی کسوٹی فراہم کرنا تاکہ باطل نظریات کا شکار نہ ہوں اور اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا دفاع کر سکیں۔

۳۔ ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کی نشو و نما کرنا اور انہیں صحیح رخ پر ڈالنا۔

۴۔ ورزش اور کھیل کود کی حوصلہ افزائی کرنا اور صحت سے متعلق معلومات فراہم کرنا، صفائی، ستھرائی اور حفظان صحت کے اصولوں سے باخبر کرنا۔

۵۔ خاندانی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا اہل بنانا۔

۶۔ سیرت و کردار سازی پر توجہ دینا۔

معاشی ذمہ داریوں کا اہل بنانا تعلیم کے مقصد میں شامل نہیں ہے، تاہم اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، اس لیے اس کی طرف بھی توجہ ہونی چاہیے اور تعلیم کے ذیلی مقاصد میں شامل کیا جانا چاہیے۔

۷۔ تعلیم برائے علم کی اسلام کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں ہے۔

۸۔ ایسی چیزوں کو جاننے کی جن کے ذریعہ فرصت کے اوقات کو مشغول کیا جا سکے اجازت ہے۔

۹۔ مملکت اور ریاست کا اچھا شہری اور سماج کا بے لوث خادم بنانا بھی تعلیم کا ایک مقصد ہے۔

☆☆☆

حواشی و تعلیقات:

(۱) سورۃ آل عمران: ۱۸ (۲) سورۃ العنکبوت: ۴۳ (۳) سورۃ النساء: ۸۳ (۴) سماج کی تعلیم و تربیت: ۲۵، از محمد رابع حسنی ندوی، مطبوعہ مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ ۱۴۰۵ھ (۵) سورۃ آل عمران: ۷۹ (۶) کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ صحیح بخاری: ۱۳۸۵ کتاب الجنائز (۷) روی مرفوعا العلم فی الصغر کالنقش فی الحجر، رواہ البیہقی والطبرانی فی الاوسط، تربیۃ الاولاد: ۲۰۷ (۸) ابوداؤد: ۴۹۳، سنن الترمذی، وقال الالبانی ضعیف، مطبوعہ مکتبہ المعارف الریاض ۲۰۰۷ء (۹) افتحوا علی صبیانکم اولکلمۃ بلا الہ الا اللہ، رواہ الحاکم فی المستدرک، تربیۃ الاولاد ج ۱ ص ۱۱۷ (۱۰) سنن ترمذی: ۵۹۹۶، حدیث: ۲۵۱۲ وقال الالبانی صحیح، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق (۱۱) تربیۃ الاولاد فی الاسلام ج ۱ ص ۱۱۹، از عبداللہ ناصح علوان، مطبوعہ دارالسلام القاہرہ ۲۰۰۷ء (۱۲) سنن ابی داؤد: ۹۰، وقال الالبانی حسن صحیح، مطبوعہ مکتبہ المعارف الریاض (۱۳) سورۃ لقمان: ۱۳ (۱۴) ان اللہ کتب الاحسان علی کل شئی...... صحیح مسلم: ۵۵۷ حدیث: ۱۹۵۵، کتاب الصید، مطبوعہ المکتبۃ العصریہ بیروت ۲۰۰۲ء (۱۵) فالھمھا فجورھا وتقوٰھا قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا، الشمس: ۸-۱۰ (۱۶) ما نحل والد ولدا افضل من حسن ادب، سنن ترمذی: ۴۴۳، حدیث: ۱۹۵۲، کتاب البر والصلۃ، قال الالبانی ضعیف (۱۷) سنن ابن ماجہ: ۶۰۹ حدیث: ۳۶۷۱، کتاب الادب باب بر الوالد والاحسان الی البنات، وقال الالبانی ضعیف جدا، مطبوعہ الریاض (۱۸) السنن الکبریٰ للبیہقی، تربیۃ الاولاد ج ۱ ص ۱۳۶ (۱۹) رواہ عبدالرزاق وسعید بن منصور، تربیۃ الاولاد ج ۱ ص ۱۱۴ (۲۰) سورۃ السجدہ: ۹ (۲۱) سورۃ بنی اسرائیل: ۳۶ (۲۲) وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم سورۃ البقرۃ: ۲۴۷ (۲۳) صحیح مسلم (۲۴) تربیۃ الاولاد ج ۱ ص ۱۷۶ (۲۵) فن تعلیم و تربیت: ۳۹، از افضل حسین، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۲۰۰۸ء (۲۶) مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ: ۱۸۵، از پروفیسر سید محمد سلیم، مطبوعہ ادارہ تعلیمی تحقیق اچھرہ لاہور (۲۷) اصول تعلیم: ۲۰، از ڈاکٹر ضیاء الدین علوی، مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۷ء (۲۸) فن تعلیم و تربیت: ۳۲-۳۳ (۲۹) تربیۃ الاولاد ج ۱ ص ۱۳۶

(۳۰) سماج کی تعلیم و تربیت: ۹۱

جامعہ کے لیل ونہار

عبدالرقیب فلاحی

تعلق بالقرآن-اہمیت اور تقاضے کے عنوان پر سیمینار

تعلق بالقرآن-اہمیت اور تقاضے کے عنوان پر یکم تا ۳؍اپریل ۲۰۱۱ء کو جامعہ میں منعقد ہونے والا سیمینار بحسن وخوبی اختتام کو پہنچا۔

افتتاحی اجلاس کا آغاز عبدالحمید حاکم فلاحی کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ محمد عالم اوران کے رفقاء نے ترانہ جامعہ پیش کیا، افتتاح مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی سابق مفتی اعظم پنجاب نے کیا، نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر فلاحی نے انجام دیے، خطبہ استقبالیہ مولانا محمد طاہر مدنی (ناظم جامعۃ الفلاح) نے پیش کیا، صدارت پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب (ناظم دارالمصنفین) نے کی، کلیدی خطبہ ڈاکٹر عرفان احمد خان صاحب (صدر ایسوسی ایشن فار قرآنک انڈر اسٹینڈنگ شکاگو، امریکہ) نے پیش کیا، خصوصی خطاب مولانا ولی اللہ سعیدی فلاحی صاحب، امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند یوپی مشرق اور مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اعظم گڑھ نے پیش کیا، کلمات تشکر مولانا محمد سلامت اللہ اصلاحی صاحب مہتمم تعلیم وتربیت جامعۃ الفلاح نے ادا کیے، یادگار مجلہ کا اجراء پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے کیا۔

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے کہا کہ قرآن کو عملی تحریک بنانے کی ضرورت ہے اس کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں ان کا تدارک ہمارے عمل ہی کر سکتے ہیں۔ افتتاحی خطبے میں مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے کہا کہ حضور اکرم کی سیرت قرآن پاک کا مکمل نمونہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ عمل سے دلوں میں احترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مفتی صاحب نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ بچوں کے اندر قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کی روش کمزور ہوتی جارہی ہے جبکہ قرآنی انقلاب سے ہی دنیا اور امت دونوں کا بھلا ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر عرفان احمد خاں (شکاگو) نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے لوگوں کو قرآن کا چلتا پھرتا نمونہ بننے کی دعوت دی۔ انھوں نے کہا کہ ہر ہر فرد کو قرآن سے جڑنے کی ضرورت ہے۔ یہ

سرچشمہ ہدایت بھی ہے اور ہمارے دکھوں کا علاج بھی۔ ڈاکٹر عرفان نے اس بات پر زور دیا کہ ہم قرآن کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ علم سے عمل کی راہیں کھلتی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ عمل کے بغیر قرآن کو نہیں سمجھا جاسکتا۔

ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی نے مہمانوں اور حاضرین کا استقبال کیا۔ انھوں نے کہا کہ قرآن ہماری زندگی کی رہنمائی کے لیے آیا ہے مگر اسے ہم نے محض تبرک اور ثواب کا ذریعہ بنا رکھا ہے انھوں نے اپیل کی کہ ہم قرآن مجید کو مکمل طور پر اپنا رہنما بنالیں۔ ناظم جامعہ نے کہا کہ آج ہماری زندگیاں قرآنی اخلاق کی جھلک سے خالی ہیں اور ہم میں قرآنی دعوت کو لے کر اٹھنے کا جذبہ سرد پڑ چکا ہے۔ مولانا طاہر مدنی نے یہ بھی کہا کہ اس سیمینار کا اصل مقصد قرآن پاک سے تعلق کو استوار کرنا اور اس کے عملی تقاضوں کی تکمیل کے لیے آمادہ کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ امت کو قرآن پر غور وفکر کے لیے تیار کیا جائے اور اس کے اندر قرآن پاک پر عمل کرنے کا جذبہ بیدار ہو۔

اس موقع پر مولانا ولی اللہ سعیدی فلاحی نے قرآن مجید کے پانچ حقوق بیان کیے اور کہا کہ قرآن ہر طرح کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے آیا ہے۔ بندگان خدا کے مسائل کا حل قرآن مجید کے جامع اصولوں کی روشنی میں ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی نے کہا کہ ان دنوں تمام مکاتب فکر کے لوگ قرآن کی تعلیم پر زور دے رہے ہیں جو نہایت خوش آیند بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں قرآن کے عملی تقاضوں پر بطور خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے کہا کہ جامعۃ الفلاح نے اپنے نصاب میں قرآن پاک کو مرکزی اور محوری حیثیت دی ہے اور فہم قرآن کے لیے اپنے طلبہ پر کسی خاص تفسیر سے استفادہ کی شرط عائد نہ کرکے جس کشادہ ذہنی کا ثبوت دیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ آج کا یہ علمی مذاکرہ جامعہ کے منتظمین کی اسی قلبی کشادگی کا مظہر ہے۔

اس سیمینار میں افتتاحی واختتامی اجلاس کے علاوہ کل پانچ اجلاس برائے مقالات اور ایک اجلاس برائے خطاب عام بعنوان ''قرآن کا پیغام انسانیت کے نام'' منعقد ہوا، جس میں عظمت قرآن، حقوق قرآن مجید اور اس کے عملی تقاضوں کے علاوہ اس کے داخلی وخارجی وسائل تفسیر وتفہیم پر ملک و بیرون ملک کے مختلف علما و دانشوروں نے ۴۴؍مقالات پڑھے، جن کو ان شاء اللہ ''مرکز القرآن جامعۃ الفلاح کی طرف سے کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا۔

مختلف اجلاس کی صدارت بالترتیب مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی، مولانا انیس احمد اصلاحی صدر مدرس مدرسۃ الاصلاح، مولانا محمد سلامت اللہ صاحب اصلاحی، ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی،

مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی (شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح) اور مفتی فضیل الرحمٰن عثمانی صاحب نے فرمائی، خطاب عام کے خصوصی مقرر مولانا انیس آزاد بگرامی قاسمی مہتمم جامعہ سید المدارس صاحب تھے۔

مولانا انیس احمد فلاحی مدنی نے سہ روزہ سیمینار کی رپورٹ پیش کی، واضح رہے کہ دو اور تین اپریل کو بعد نماز فجر ڈاکٹر عرفان احمد کی نگرانی میں مطالعہ قرآن کا اہتمام کیا گیا، اس موقع پر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ڈاکٹر عرفان احمد خان راؤ، حافظ سعید احمد، ڈاکٹر محمد ارشد اعظمی، مولانا عمر اسلم اصلاحی اور مولانا اسعد اعظمی وغیرہ نے تاثرات پیش کیے، ناظم جامعہ کی دعا پر اختتام ہوا۔

قرارداد سہ روزہ سیمینار "تعلق بالقرآن، اہمیت اور تقاضے"

قرآن ایک زندہ و تابندہ اور حیات بخش کتاب ہے، وہ مشعل راہ، رہنما اور نسخۂ شفا ہے، جنھوں نے اسے تھاما اور اس کے مطابق زندگی گزاری وہ دنیا میں بھی سربلند ہوئے اور آخرت کی فلاح بھی یقینی ہے اور جس نے اسے پس پشت ڈالا وہ ہر جگہ ناکام و نامراد ہوا۔

ذلت وجہالت کے دلدل سے نکلنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس سے اپنا رشتہ استوار کیا جائے اسے اپنی زندگی میں بسایا جائے اور دل کے طاق میں سجایا جائے۔ اس مقصد عظیم کے پیش نظر جامعۃ الفلاح میں ایک سہ روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا جو اپنی بنیاد کے پہلے دن سے اس کے لیے کوشاں ہے۔

"تعلق بالقرآن، اہمیت اور تقاضے" کے عنوان سے منعقد اس سیمینار کے شرکاء نے اس بات پر اتفاق کیا کہ امت کی زبوں حالی، خوارگی اور درماندگی کی بنیادی وجہ اللہ کی کتاب سے دوری اور اس کے رسول کی سنت سے بے اعتنائی ہے، اور کامیابی وسربلندی کا راستہ رجوع الی القرآن سے ہی وابستہ ہے، جب تک ایک ایک فرد براہ راست قرآن سے نہیں جڑے گا اور اس کی رہنمائی کے مطابق اپنی زندگی بسر نہیں کرے گا اور اسوہ نبوی کو نہیں اپنائے گا ہمارے حالات میں تبدیلی نہیں آسکتی ہے۔

ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی کی تعمیر قرآن مجید کی بنیاد پر ہونی چاہیے اور قرآنی دعوت کو دنیا کے سامنے عمدہ طریقے سے پیش کرنے کے لیے امت کو تیار کرنا چاہیے۔

شرکاء سیمینار نے رجوع الی القرآن کی تحریک کو موثر بنانے کے سلسلے میں درج ذیل قراردادیں منظور کیں:

۱۔ تعلق بالقرآن کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی اس کتاب سے ہمارا والہانہ لگاؤ ہو، اس کو صحیح طریقے سے پڑھنے، سمجھنے، اثر لینے اور عمل کرنے کی صورت میں ہی اس کے تقاضے پورے ہوں گے،

لہٰذا اس پہلو سے امت کے اندر بیداری لانے اور لگن پیدا کرنے کی ہر سطح پر کوشش کی جائے۔

۲۔ مکاتب میں بچوں کو ابتداء ہی سے قرآن مجید کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ تجوید و ترتیل اور آداب تلاوت کے ساتھ ساتھ ان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ یہ کتاب پڑھنے، سمجھنے اور عمل کرنے کے لیے ہے۔

۳۔ ہر فرد کو قرآن مجید کے الفاظ ومعانی سے جڑنے کی ترغیب دی جائے کیونکہ اللہ کی کتاب کی بدل کوئی دوسری چیز ہرگز نہیں ہو سکتی ہے۔

۴۔ دروس قرآن مجید اور اجتماعی مطالعہ قرآن کے حلقے زیادہ سے زیادہ قائم کیے جائیں اور لوگوں کے اندر قرآن فہمی کا ذوق وشوق پیدا کیا جائے۔

۵۔ صحیح طریقے سے تدبر پر زور دیا جائے، اور قرآن مجید کے بنیادی مقاصد (ہدایت وتذکیر) کی اہمیت واضح کی جائے، نیز قرآن فہمی وتدبر فی القرآن کے آداب وشرائط کی تفہیم کرائی جائے۔

۶۔ مدارس میں قرآن مجید کی تدریس پر خصوصی توجہ دی جائے اور طریقہ تدریس کو زیادہ موثر بنایا جائے تاکہ طلبہ قرآنی تعلیمات کا پیکر بن سکیں۔

۷۔ عوام میں دروس قرآن کا اہتمام کیا جائے، تاکہ ان تک قرآن مجید کا پیغام پہنچ سکے۔

۸۔ قرآن مجید پر صحیح انداز سے غور وفکر کرنے اور اس کے تقاضوں کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے کی کوشش کرنے والوں کے درمیان گہرا رابطہ ہونا چاہیے اور رجوع الی القرآن کی تحریک کو باہمی تعاون واشتراک کے ذریعے وسیع اور زیادہ موثر بنانے کی کوشش کی جائے۔

۹۔ اہل مدارس کے درمیان اس موضوع پر مذاکروں اور ورکشاپوں کا انعقاد وقتاً فوقتاً کیا جائے تاکہ ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جاسکے اور دفاع عن القرآن کا فریضہ بھی بطریق احسن ادا ہو سکے۔

۱۰۔ قرآن مجید کی دعوت کو عام انسانوں تک پہنچانے اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے منظم کوشش کی جائے اور باصلاحیت فضلاء کو اس میدان کے لیے بطور خاص تیار کیا جائے۔

تعزیتی قرارداد

آپ حضرات کے علم میں یہ بات آچکی ہوگی کہ ملت اسلامیہ دو روز پہلے مفتی ظفیر الدین مفتاحی (سرپرست فقہ اکیڈمی آف انڈیا اور صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) کے سانحہ وفات کے صدمے سے دوچار ہو چکی ہے۔ موصوف دارالعلوم دیوبند کے منصب افتاء پر ایک عرصے تک فائز رہے۔ ان

کے اہم کارناموں میں سے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی ترتیب وتخریج ہے۔ وہ ایک وسیع المطالعہ اور عالی ظرف عالم دین تھے اور ملی اتحاد کے لیے کوشاں رہا کرتے تھے۔ ان کی وفات ملت اسلامیہ کے لیے ایک عظیم خسارہ ہے۔ یہ سہ روزہ سیمینار ان کی وفات پر دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں جگہ دے، دارالعلوم دیوبند کو ان کا نعم البدل اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اعلان:

جامعۃ الفلاح اس موقع پر ایک ''مرکز القرآن الکریم'' کے قیام کا اعلان کرتا ہے جس کا مقصد رجوع الی القرآن کی کوششوں کے درمیان ربط وتعلق قائم کرنا اور قرآن سے متعلق مختلف النوع معلومات کو اکٹھا کرنا ہے۔

خدمت خلق کے عظیم مرکز ''الفلاح ہاسپٹل'' کی افتتاحی تقریب

۵/اپریل ۲۰۱۱ء بروز دوشنبہ ۱۰ بجے صبح خدمت خلق کے عظیم مرکز ''الفلاح ہاسپٹل'' کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ تلاوت کلام پاک سے تقریب کا آغاز ہوا، اور ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انسانوں کی خدمت اسلام کی ایک بڑی تعلیم ہے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسانوں کی خدمت کی جائے بلاتفریق مذہب وملت انکے دکھ درد میں شرکت کی جائے حضورؐ کے ارشاد کے مطابق تمام لوگ اللہ کا کنبہ ہیں اور انکے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس پورے کنبہ کے لیے نفع بخش ہو'' انہوں نے کہا کہ جامعۃ الفلاح میں اس ہاسپٹل کی تعمیر کا مقصد انسانیت کی خدمت ہے اور بلا کسی تفریق کے ہر شخص کو مناسب علاج فراہم کرنا اس کے پیش نظر ہے، ایک عبادت کی ادائیگی کی نیت سے اس ہاسپٹل کی تعمیر زیر عمل آئی ہے، اس ہاسپٹل کا دروازہ ہمیشہ ہر شخص کے لیے کھلا رہے گا، انہوں نے تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا جن کے تعاون سے چیریٹی ہاسپٹل افتتاح کے قابل ہوسکا انہوں نے فرمایا کہ ہاسپٹل میں چند مستقل ڈاکٹروں کے علاوہ متعدد ماہر ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کی جائے گی۔

ڈاکٹر جاوید اختر اعظم گڑھ، نے اس موقع پر انگریزی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے، اولاً فن طب، تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کے میدان میں اعظم گڑھ کی خدمات، کا تذکرہ فرمایا اور مہمان کا پرزور استقبال کرتے ہوئے اس ہاسپٹل کی تعمیر میں انکی خدمات اور تعاون پر ان کو مبارک باد پیش کیا، انہوں نے پوری دنیا میں ہندوستانی ڈاکٹروں کی بہترین طبی

خدمات کا بھی تذکرہ فرمایا انہوں نے کہا کہ آج کا دن جامعۃ الفلاح کی تاریخ میں ایک اہم دن ہے کہ انسانیت کی خدمت کے پیش نظر ایک چیریٹی ہاسپٹل کی تعمیر عمل میں آئی ہے انہوں نے فرمایا کہ انشاءاللہ مستقبل میں یہ ہاسپٹل قومی ہاسپٹل میں تبدیل ہوگا، ہر طرح کی طبی سروس فراہم ہوگی اور لوگوں کو اعظم گڑھ اور بنارس جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی انہوں نے اس ہاسپٹل کے لیے اپنے اور اپنے ساتھی ڈاکٹروں کی جانب سے مکمل تعاون کا اعلان فرمایا۔

الشیخ مسلم الزامل (سکریٹری جمعیت بشائر الخیر) نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس تقریب افتتاح میں شرکت میرے لیے باعث سعادت ومسرت ہے انہوں نے کہا کہ ادائے عبادت اور خدمت انسانیت کے پیش نظر اس ہاسپٹل کی تعمیر ہوئی ہے جس سے ہر علاقہ اور ہر مذہب کے لوگ مستفید ہوسکتے ہیں، ایمانی اخوت اور بھائی چارگی کی وجہ سے ہم آپ حضرات تک پہونچ سکے ہیں، یہ دینی فریضہ ہے کہ ہر ایک، دوسرے کا تعاون کرے، حضور کا ارشاد ہے کہ جو مسلمانوں کے معاملات میں دلچسپی نہ لے وہ مسلمان نہیں، انھوں نے کہا کہ جن افراد نے اس ہاسپٹل کی تعمیر میں حصہ لیا ہے وہ قابل مبارک باد ہیں، یہ ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

الشیخ عبدالحمید جاسم البلالی (ڈائرکٹر جمعیت بشائر الخیر) نے فرمایا کہ ایک صحیح حدیث کے مطابق بنی اسرائیل کی ایک پیشہ ور بدکار عورت کی صرف اس لیے مغفرت کردی گئی کہ اس نے ایک انتہائی پیاسے کتے کو سیراب کیا تھا، انہوں نے کہا کہ جب جانوروں کے ساتھ اظہار ہمدردی کا یہ اجر وثواب ہے تو انسانوں کے ساتھ اظہار ہمدردی پر کتنا ثواب ملے گا، انہوں نے کہا کہ قرآن وسنت نے انسانیت کی خدمت کی جو تعلیم دی ہے یہ ہاسپٹل اسی کا مظہر ہے یہ اہل خیر حضرات کی طرف سے آپ کے لیے ایک ادنیٰ ساتحفہ ہے خدا کرے کہ یہ سماجی ضروریات کی تکمیل کا ایک ایسا مرکز قرار پائے جس شاخیں مختلف مقامات پر ہوں اور جسکے توسط سے بہتر طریقہ ہائے علاج کے ذریعہ انسانی خدمات کا فریضہ انجام پاتا رہے۔

ہاسپٹل کا افتتاح شیخ عبدالحمید البلالی اور انکے رفقاء کے مبارک ہاتھوں انجام پایا اس افتتاحی تقریب میں قرب وجوار کی جو معزز ومحترم شخصیات موجود تھیں ان میں ڈاکٹر جاوید اختر اعظم گڑھ، ڈاکٹر کمال الدین (ونٹیشت)، ڈاکٹر فخر عالم، ڈاکٹر خورشید عالم، ڈاکٹر صہیب، مولانا عامر رشادی، ڈاکٹر ابرار اعظمی، اور گرپا لیکا چیرمین طریا گنج وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، نظامت کے فرائض مولانا محمد سلامت اللہ اصلاحی نے انجام دیے، اس تقریب میں خصوصی مہمانوں کو ھدایا اور تحائف سے نوازا گیا۔

روداد انجمن

بلریاگنج یونٹ

الحمد للہ مقامی یونٹ کی دوسری سہ ماہی میٹنگ ۱۳؍ مارچ بروز اتوار بمقام مرکز اسلامی منعقد ہوئی جس میں تقریباً تیس فلاحی برادران شریک ہوئے۔ مہمان خصوصی مولانا اسعد اثری فلاحی صاحب تھے۔ میٹنگ میں خاص طور پر فلاحی برادران کے آپسی ربط و تعلق، اپنی اصلاح آپ اور جامعۃ الفلاح کی تعمیر و ترقی جیسے اہم مسائل پر گفتگو ہوئی۔ شرکاء کی مختلف تجاویز سامنے آئیں۔

پروگرام کی ابتداء جناب حافظ جاوید سلطان فلاحی کی تلاوت سے ہوئی۔ افتتاحی کلمات امتیاز احمد فلاحی سکریٹری انجمن نے پیش کیا۔ تذکیر و اصلاحی باتیں جناب جاوید سلطان احمد فلاحی کی جانب سے آئیں۔ آخر میں مولانا اسعد اثری فلاحی کی دعا پر میٹنگ اختتام پذیر ہوئی۔

سکریٹری انجمن
امتیاز احمد فلاحی، بلریاگنج یونٹ

فلاح یونٹ

الحمد للہ فلاح یونٹ کی انتخابی نشست ۲۸/۳/۲۰۱۱ء کو نائب صدر مولانا مقبول احمد فلاحی کی صدارت میں ابواللیث ہال میں منعقد ہوئی۔ جس میں تقریباً بیس افراد نے شرکت کی انیس احمد فلاحی کو یونٹ کا صدر اور مولانا کمال الدین صاحب کو سکریٹری منتخب کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی ذمہ داریاں بحسن خوبی انجام دینے کی توفیق بخشے۔

☆☆☆